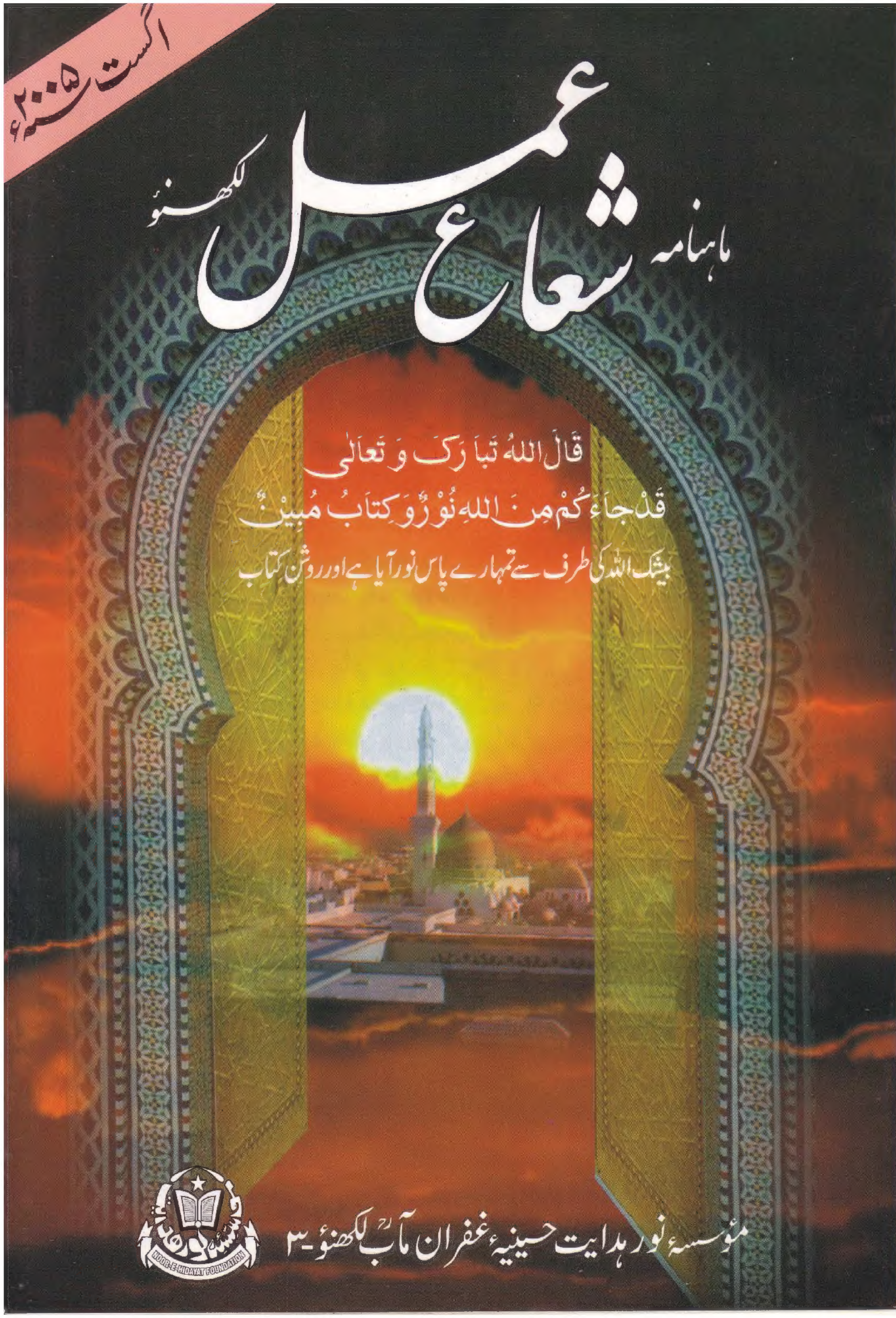


Postal Regd.No.SSP/LW/NP-75/2005-07

Monthly

SHUA-E-AMAL

Lucknow

शुआ-ए-अमल

हिन्दी, उर्दू मासिक पत्रिका

लखनऊ

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION

Imambara Ghufran Maab, Chowk

LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA

Phone : 2252230

فہرست مضامین

اگست ۲۰۰۵ء

سخنان

ماہ شعبان بہت سی اسلامی یادوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے پھر جومہینہ سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتساب رکھتا ہو اور جس میں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ اور منتقم خون حسینؑ حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف اور سقائے حرم، علمدار لشکر حسینی، مرکز مہر ووفا حضرت ابوالفضل العباسؑ کی ولادت باسعادت ہو ایسے ماہ مبارک ومسعود کا کیا کہنا۔

۱۹/رجب المرجب کو بحر العلوم آیۃ اللہ العظمیٰ السید دلدار علی النقوی المعروف بہ غفران مآب علیہ الرحمۃ والرضوان کی برسی تھی۔ ایک بڑے مجمع نے احسان مندانہ عقیدت کا خراج پیش کیا۔ مجد اعظم کی قبر مطہر پر گل افشانی وفاتحہ ودعا خوانی کا کافی وقت تک سلسلہ رہا۔ جو کچھ ہوا اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ ہندوستان میں صحیح صورت میں شیعیت کو آپ ہی نے رائج فرمایا۔ صوفیت کو جاں بلب کیا، بدعات کو اکھاڑ پھینکا، غیر اسلامی رسوم پر پانی پھیر دیا اور اخباریت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہند میں شیعوں کی نماز جماعت وجمعہ کی ابتدا فرمائی اور نشر علوم محمدؐ وآل محمدؐ کے لئے سیکڑوں افراد کو تعلیم دے کر پورے ہندوستان میں بکھیر دیا۔ ایسے مصلح اکبر کے احسانات سے کون شیعہ سبکدوش ہوسکتا ہے۔

آقائے قوم قدوۃ العلماء کی تحریک دینداری وبیداری

(گذشتہ سے پیوستہ)

جیسے مدرسہ کی آقائے قوم تحریک چلا رہے تھے ویسا مدرسہ ۲۵/ذیقعدہ ۱۳۲۱ھ جنوری ۱۹۰۴ء کو ''مدرسہ امامیہ انجمن صدر الصدور وکانفرنس امامیہ اثنا عشریہ'' کے نام سے بمقام حسینیۂ ہدایت مآب ناصر دین وناشر احکام شرع متین مؤسس اسلام وایمان مومنین جناب سید دلدار علی نقوی صاحب غفرانمآب علیہ الرحمہ (جن کی ہدایت وفیض سے کوئی مقام ہندوستان کا اس وقت تک خالی نہیں ہے) قائم کیا گیا۔ یہ مدرسہ ابتدائی درجات سے لیکر انتہائی درجات تک تھا اور بارہ درجوں پر منقسم تھا اور ہر درجہ میں کورس اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ سب ضروری چیزیں مثلاً فارسی، عربی، انگریزی، ریاضی، طب، دینیات، معقولات اور صنعت وحرفت داخل تھے۔ غرض یہ تھی کہ جو طالب علم تمام درجات طے کر کے نکلے گا وہ فارسی داں، عربی داں، انگریزی داں اور صاحب حرفت وصنائع مختلفہ ہوگا۔ مدرسہ کے معیاری اساتذہ سے مومنین نے دینی ودنیوی فائدے اٹھائے۔ اسی مدرسہ کے افتتاح کے موقع پر آقائے قوم نے اپنی فصیح وبلیغ معرکۃ الآراء تقریر میں علی گڑھ کالج کے طرز پر ایک شیعہ کالج قائم کرنے کی بات رکھی تھی۔ اگر چہ معمار ملت کے اس خیال وفکر کی ترجمانی کانفرنس کا مذکورہ مدرسہ خود

کررہا ہے۔اس انجمن نے ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۷ء تک معمار ملت کے انصرام میں ہندوستان میں اصلاح امور معاد ومعاش وترقی دین وملت کے لیئے سعی پیہم سے کام لیا اور کامیابی سے اپنے چندسال گذارے۔

انجمن مذکور کا ایک شعبہ دارالذکر کے نام سے جوہری محلہ میں قدوۃ العلماء کی نگرانی میں اور گولہ گنج میں پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوؔا ایڈیٹر ''الحکم'' کے زیر انتظام قائم ہوا تھا جس میں سنی اور شیعہ جمع ہوتے تھے۔اخبار ورسائل پڑھے جاتے تھے، مذہب اسلام کی حمایت اور رد مذاہب باطلہ کا ذکر اور چرچا ہوتا تھا۔

۲-ماہنامہ ''معالم''

زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب مرحوم ''تاریخ لکھنؤ'' حصہ دوم صفحہ ۱۰۳ پر رقمطراز ہیں کہ ''حضرت قدوۃ العلماء وہ بلند ہستی ہے جس نے شیعوں میں بیداری کی لہر دوڑائی اور انجمن صدر الصدور کو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کیا۔۔۔۔۔۔۔دنیائے صحافت کو معلوم ہو کہ (لکھنؤ میں شیعوں کا) پہلا پرچہ ماہنامہ 'معالم' انہوں نے نکالا۔ پہلا اخبار 'الناطق' ان کے گھر سے نکلا۔ وہ عوام کے مجتہد تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہونے والے کے لیئے وقت ملاقات مقرر نہ تھا۔ان کو کہیں جانے کے لیئے سواری کی ضرورت نہ تھی۔۔۔قدوۃ العلماء کی سادگی اور روحانیت اور خدمت خلق تن تنہا مرکز تھی جس پر غیر مسلمین کو بھی ناز تھا۔'''' سوانح حضرت غفرانمآبؒ'' میں بھی زبدۃ العلماء کا بیان ہے کہ قدوۃ العلماء سید آقا حسن مجتہد۔۔۔قوم میں بیداری کی روح پھونکنے والے، ماہنامہ معالم اور ہفتہ وار 'الناطق' کے بانی تھے۔

یہ ایک ماہوار علمی رسالہ تھا جس کے مدیر ومولف آقائے قوم خود ہی تھے۔جس کا پہلا شمارہ جلد اول یکم محرم الحرام ۱۳۱۸ء کو شائع ہوا تھا۔جس میں رسالہ کے اغراض ومقاصد جو شائع ہوئے تھے وہ حسب ذیل ہیں:

اغراض وضوابط ماہنامہ 'معالم'

غرض وغایت اس رسالہ کی یہ ہے کہ ہر قسم کے اعلیٰ درجہ کے مضامین علمی وتاریخی واخلاقی وتمدنی وحکمی ومذہبی اور مسائل علمی و احادیث اور تمام ایسے مضامین جو مفید ہوں اور خلاف شرع یا خلاف تہذیب وقانون نہ ہوں، ملک کے عالی خیال لوگوں کی خدمت میں پیش کرے تاکہ ہر قسم کے علم وفن سے آگاہی حاصل ہو۔ وہ لوگ جن کی نگاہیں مضامین علمیہ ڈھونڈھا کرتی ہیں، جن کے دلوں میں ایک قسم کا جوش ہے ان سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ اس رسالہ کو وقتاً فوقتاً اپنے گرانقدر وبیش بہا مضامین سے مزین فرماتے رہیں۔

قدردانان علم وہنر سے گذراش ہے کہ اس رسالہ کی اس قدر اعانت کی جاوے جس سے اس کی زندگی کو قیام ہو۔اس رسالہ کی قیمت فی الحال بخیال تعمیم نفع صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ سالانہ علاوہ چھ آنہ محصول ڈاک کے قرار دی گئی ہے۔

اگر کوئی پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے تو تاریخ اشاعت سے دو ہفتہ کے اندر اطلاع کرنے سے بلا قیمت ارسال خدمت کیا جائے گا۔

جملہ خط وکتابت وارسال مضامین یا ارسال قیمت متولی کارخانہ عمادالاسلام جناب قدسی القاب مولانا السید آقا حسن مدظلہ العالی کے نام ہونا چاہیئے۔ مالک وبانی اس کے مولانا سید کلب حسین صاحب مالک کارخانۂ عمادالاسلام ہیں۔

پتہ:-قبلہ وکعبہ قدوۃ العلماء جناب السید آقا حسن صاحب دفتر کارخانۂ عمادالاسلام جوہری محلہ لکھنؤ۔

المشتہر: محمد ناصح مینیجر کارخانۂ عمادالاسلام

(جاری)

(ادارہ)

قرآن شناسی

قرآن کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات

حجۃ الاسلام جناب محمد علی تسخیری صاحب
ترجمہ: جناب مولانا خادم حسین، ایم۔اے۔علیگ

(گذشتہ سے پیوستہ)

لیکن اپنے تجزیہ و تحلیل میں جن نکات پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں، وہ ہیں:

۱۔امت اسلامیہ کو انسانی معاشرے میں دوسری ملتوں کے لئے نمونہ ومثال بنانے کی کوشش :

قرآن مجید جس امت اسلامیہ کا ذکر کرتا ہے وہ امت وسطیٰ ہے اور وسطیٰ سے مراد ''اعلیٰ نمونہ'' ہے، جیسے موتیوں کی لڑی میں سب سے بڑے اور قیمتی درمیانی موتی جو قدر و قیمت کے اعتبار سے دوسرے موتیوں پر بھاری ہوتا ہے۔

''لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآئَ عَلَی النَّاس'' کی رو سے یہی امت شاہد ہے اور یہی دوسری امتوں میں سب سے بہتر ہے۔ ''خیر امة أخرجت للنّاس'' لہٰذا اسلامی خارجہ سیاست یا دوسرے مراحل میں تمام مقاصد حاصل کرنے کے لئے داخلی سیاست سے ہم آہنگی ضروری ہے، یہی امتیاز امت کو کسی نہ کسی طرح دوسروں کے تجربوں سے با اصول فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

امت اسلامیہ کے مثالی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں سربلندی حاصل کرکے انسانی تہذیب وتمدن کو فروغ دینے کا عمل بحسن خوبی انجام دے سکے۔

ہم یہ بات کہتے ہوئے اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتے کہ امت کو جس منزل پر ہونا چاہئے، متعدد وجوہ کی بنا پر اس سے کافی دور ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ منزل مقصود تک رسائی کی کوششیں چھوڑ دے اور خاص طور پر جب یہ معلوم ہو کہ بین الاقوامی تعلقات قائم کرنا اور بین الاقوامی طور حرکت واقدامات کا یہی وقت ہے۔

۲۔تعلقات عامہ کے اصول:

عام طور پر ہر سیاسی جماعت کا لائحہ عمل کچھ اصول وضوابط پر مبنی ہوتا ہے، خواہ وہ اس کا داخلی نظام ہو یا خارجی۔

اسلامی حکومت، بنیادی اعتبار سے ایک نظریاتی واصولی حکومت ہے، وہ انسانی زندگی کے انفرادی ومعاشرتی تمام منصوبے اپنے خاص اصولوں کی بنیاد پر تیار کرتی ہے۔

وہ دوسروں سے اسی حد تک دور یا نزدیک ہوتی ہے جس حد تک وہ اس کے اصول سے دور یا نزدیک ہوں، غرض یہ کہ اسلامی حکومت اصول سے ہٹ کر تعلقات قائم نہیں کرتی، اس لئے اصول کی روشنی میں بھی بین الاقوامی

تعلقات معیّن کئے جاسکتے ہیں یعنی وہ روابط کس طرح کے ہوں؟ بنیادی طور پر اچھے ہوں؟ دوستانہ ہوں یا خراب ہوں؟

برادرانہ تعلقات: یہ تعلقات ایمان کی بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں، اور زندگی کے ہر شعبہ میں ایمانی اخوت اور بھائی چارگی کی نشان دہی کرتے ہیں، لہٰذا جولوگ ایمان کی دولت سے عاری ہیں ان سے اس قسم کے تعلقات قائم نہیں کئے جاسکتے۔

۳۔کافروں کی بالادستی کا سد باب:

مسلمانوں پر کافروں کی برتری کا سد باب، خارجہ سیاست کے اصولوں میں سب سے اہم اصول ہے اور اسے ایک حیثیت سے پہلے ضابطے کا تتمہ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ ضابطہ اسلام اور مسلمانوں کی برتری کو دوسرے نظریاتی گروہوں پر ظاہر کرتا اور مسلمانوں کی اس عظمت کی نشان دہی کرتا ہے جس کے بارے میں کوئی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں۔ اس قاعدے کی رو سے ہر وہ قرارداد یا کام، جس کے ذریعہ کافروں کو مسلمانوں پر برتری حاصل ہو بنیادی طور پر غلط ہوگا۔ فقہا کا کہنا ہے کہ یہ قاعدہ ''لاضرر ولاضرار فی الاسلام'' اور ''نفی العسر والحرج'' کی طرح ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اور حکم جہاد (جس میں بنیادی طور پر ایک معین ہدف تک رسائی کے لئے نقصان کا متحمل ہونا لازمی ہے) کے سوا باقی تمام دوسرے احکام پر حکم فرما ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ درج ذیل دلائل کی رو سے درست مانا جاتا ہے۔

(الف) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَلَن يَجعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (النساء:۱۴۱)

اور خدا ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دے گا۔

(ب) وہ احادیث جو بعض حالتوں میں اصول وقانون وکلیہ بتاتی ہیں۔ بعنوان مثال ''من لایحضرہ الفقیہ'' کی حدیث:

''الاسلام یعلوولایعلٰی علیه والکفّار بمنزلة الموتٰی، لایحجبون ولایورثون''

(من لایحضرہ: ج۴)

اسلام دین فضیلت وبرتری ہے، اس پر کسی چیز کو فوقیت حاصل نہیں ہوسکتی اور کافروں کی حیثیت مردوں کی ہے، جو میراث میں نہ حاجب ہوسکتے ہیں نہ وارث۔

(ج) اس کی تائید اجماع فقہا سے بھی ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ حکم وموضوع یا اسلامی رجحانات کا رُخ اسی سمت ہے، دیکھئے ارشاد باری ہے:

''وللّٰه العِزّة ولِرسولِه وَلِلْمُومنينَ وَلٰكنَّ المُنافِقِينَ لَايَعلَمون'' (المنافقون:۸)

''عزت تو صرف اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے مگر منافقین نہیں جانتے۔''

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے چلیں کہ اس توجیہہ میں کسی طرح کا تکبر نہیں ہے۔ جیسے بعض لوگوں نے شبہ کیا ہے بلکہ یہ بیان دوسرے نظاموں پر اسلامی نظام کی برتری وفضیلت کو ظاہر اور سب سے کامل ہونے کی

نشان دہی کرتا ہے۔ نتیجتاً جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس نقطۂ نظر سے کہ وہ انسانی اقدار پر عمل کرتے ہیں سب سے برتر قرار پاتے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ بعض لوگ شبہ کا شکار ہو کر اقدار و معیار کے بارے میں سوال کریں۔ ایسی صورت میں دلائل کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اگر کوئی شخص اس توجیہہ کی تردید کر کے اس کی مذمت کرتا ہے اور اس کو نسلی امتیاز سے تعبیر کرتا ہے، تو اس کا یہ عمل سب سے بڑا ظلم ہے۔

مذکورہ قاعدہ تعلقات عامہ کی رو سے بڑی اہمیت کا مالک ہے اور ہر سطح پر قابل عمل بھی ہے۔ سیاسی سطح پر تو خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

عالمی استکبار جو اقوام عالم کی ثروت و دولت کو مختلف بہانوں سے ہضم کرنا چاہتا ہے۔

اس کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور سلوک اس قانون کے عملی ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

اسی قانون وضابطے پر عمل کی اہم ترین مثال، آیت اللہ مرزا شیرازی کا فتویٰ ہے وہ زمانہ، جب ناصر الدین شاہ قاچار نے حکومت برطانیہ کو تمبا کو کا ٹھیکہ دیا اور اس کا سربراہ ''رگی'' نامی شخص قرار پایا۔ اب قانون ''**لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین**'' لاگو کرنے کا لمحہ تھا۔ چنانچہ آیت اللہ مرزا شیرازی نے اپنا فتویٰ صادر کیا:

''آج سے تمبا کو اور اس سے بنی چیزوں کا استعمال حرام قرار دیا جاتا ہے، اور تمبا کو نوشی حضرت صاحب العصر والزمان (عجہ) سے جنگ کے برابر ہے۔''

مذکورہ قاعدے پر عمل درآمد کی دوسری اور اہم ترین مثال ہے CAPITALIZATION کے خلاف امام خمینیؒ مدظلہ کی تحریک ہے۔ اس معاہدے کی شرط یہ تھی کہ غیر ملکی افراد پر اُسی ملک کے قوانین کا اطلاق ہوگا جہاں کے وہ باشندے ہیں، اور نفاذ کا اختیار متعلقہ ملک کے کونسلر کو تھا۔

اس معاہدے سے غیر ملکی افراد کو قانونی گرفت سے بچانا ہی مقصود نہ تھا بلکہ انھیں مسلمانوں پر مسلط بھی کرنا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب ظالم و جابر شہنشاہی حکومت نے مذکورہ معاہدہ پر دستخط کئے تو علماء دین نے امام خمینیؒ مدظلہ کی قیادت میں مخالفت کی آواز بلند کی۔ شاہ خائن کی حکومت نے انھیں ترکی جلاوطن کر دیا۔ درحقیقت یہی پہلا موقع تھا جس میں اسلامی انقلاب کی داغ بیل پڑی اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر امام خمینیؒ مدظلہ نے اپنی جرأت مندانہ تقریر کا آغاز کلام پاک کی حسب ذیل آیت سے کیا:

''وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (النساء:۱۴۱)

اور خدا ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دے گا۔

اگر ملت اسلامیہ یا اسلامی ملکوں کے سربراہوں کا سلوک ظالم و جابر حکومتوں کے ساتھ اس کلیہ کے مطابق ہوتا، تو آج مسلمانوں کا حال یہ نہ ہوتا، آج یہ دن بھی دیکھنا پڑا ہے کہ چند اسلامی ملک نہ صرف اسرائیل جیسے دشمن، مسلمانوں کے حقوق کے غاصب اور ان کی عزت و آبرو سے کھیلنے والے کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ اس کے وجود کو اہمیت دیتے اور اسے تسلیم بھی کرتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تینوں اصول، اسلامی عزت واستقلال کی روح کو غیر ملکیوں کے ذلّت آمیز تسلط سے بچنے کی ضمانت ہیں۔

۴۔قدم بقدم آگاہی:

اسلام، دین تربیت وآگاہی ہے، وہ ایک فطری وواقعی دین کے تقاضوں کی طرح جس انسان کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے اس کو صاحب علم بنانا لازمی وفرض اولین سمجھتا ہے۔

اسلام کو جس معاشرے میں سرایت ونفوذ پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، وہاں وہ اپنے بیش بہا جواہر یہ جانتے ہوئے پیش کرتا ہے کہ ان کی قیمت کا انکشاف آسانی سے ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدہ کے معاملے میں وہ ہر طرح کی تقلید کو رد کر کے تحقیق ودلائل کی چھان بین کی دعوت دیتا ہے۔ ''**قل هاتوا برهانكم**'' اسی طرح وہ عقیدے کے بارے میں جبر وتشدد کی اجازت نہیں دیتا۔ ''**لا اكراه فی الدين**'' وہ امت کو فکر وعمل کے لحاظ سے مضبوط اور صاحب عقل وبصیرت دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جہاں تک دوسروں کو دعوت دینے اور ان سے سلوک کی بات ہے تو اسلام دلائل اور حسن خلوص کی شرط لگاتا ہے:

''**اُدعُ اِلی سَبیلِ رَبّک بِالْحِکمَة وَالْموعِظَة الْحَسَنة وَجَادِلْهُم بالتی هِیَ اَحسن اِنّ رَبّک هو اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلّ عَن سَبیله وهو اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدین۔**'' (النحل:۱۲۵)

(اے رسولؐ) تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو اس طریقے سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک گئے، ان کو تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی خوب واقف ہے۔

''**فَلِذٰلِک فَادْعُ وَاستَقِم کَما اُمِرت وَلا تَتَّبِع اَهوآئَهُمْ**'' (الشوریٰ:۱۵)

(اے رسولؐ) تم لوگوں کو اسی (دین) کی طرف بلاتے رہو اور جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے (اس پر) قائم رہو اور ان کی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

''**وَمَن اَحسنُ قَولًا مِمَّن دَعا اِلی اللّٰہ وَعَمِلَ صَالحاً وَقَالَ اِنَّنی مِن الْمُسْلِمین۔**''

(فصلت:۳۳)

اور بات میں اس سے کون اچھا ہوسکتا ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے، اور اچھے اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً (خدا کے) فرماں بردار بندوں میں ہوں۔

قُل هٰذہ سَبیلی اَدْعوا اِلی اللّٰہ عَلی بَصیرة اَنا وَمَنِ اتَّبعنی وَسُبحانَ اللّٰہ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکین۔''

(یوسف:۱۰۸)

(اے رسول) ان سے کہہ دو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں کو) خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ میں اور میرا پیرو (دونوں) مضبوط دلیل پر ہیں اور خدا (ہر عیب ونقص سے) پاک وپاکیزہ ہے، اور میں مشرکین سے نہیں ہوں۔

اس کے بارے میں شہید سید محمد باقر صدر اپنی کتاب ''اقتصادنا'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''دوسری اہم بات یہ ہے کہ مسلمان مبلّغین کو چاہئے کہ وہ ہر کام سے پہلے واضح دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیم سے لوگوں کو آشنا کریں، یہاں تک اتمام حجت ہوجائے اور صحیح منطقی بحث ومباحثہ کی گنجائش دوسروں کے لئے باقی نہ رہے۔ اگر اس کے بعد بھی نور کو رد کرتے ہیں تو (اسلامی تبلیغ جو بین الاقوامی سطح پر انسانیت کے حقیقی مفادات کو تشکیل دیتی ہے) اس کے سامنے مادی طاقت یا مسلّح جہاد کے ذریعے اپنا راستہ بنانے کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں رہتی۔ (صفحہ ۲۷۵، جلد۔۱)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت مرحوم کلینی کی کتاب ''کافی'' میں درج ہے جس میں انھوں نے فرمایا:

قال امیرالمومنین علیہ السلام: بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی الیمن، فقال: یاعلی لا تقاتلن احدًا حتّٰی تدعوہ الی الاسلام وایم اللہ لئن یھدی اللہ عزوجل علی یدیک رجلاً خیر لک مما طلعت علیہ الشمس وغربت وَلکَ ولاؤہ یاعلی''

(وسائل الشیعہ، جلد۔۱۱ ص۔۳۰)

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن کی طرف روانہ کرتے ہوئے فرمایا: اے علیؑ! جب تک تم کسی کو اسلام کی طرف آنے کی دعوت نہ دو اس وقت تک کسی سے جنگ نہ کرنا اور خدا سے ہمیشہ یہ چاہنا کہ تمہارے ذریعے کسی کو اسلام کی طرف آنے کی ہدایت کرے۔ اس لئے کہ یہ تمہارے لئے سورج کے نکلنے اور ڈوبنے سے زیادہ بہتر ہوگا۔ اور تم ہدایت یافتہ لوگوں کے ولی ہوگے۔

یہ طریقہ خدا نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو بھی سکھایا:

''اِذْهَبا اِلی فِرعَونَ اِنّه طَغیٰ، فَقُولا لَهٗ قَولًا لَینا لَعَلّه یَتَذَکَّر اَوْ یَخْشیٰ'' (طٰہٰ:۴۳۔۴۴)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ بے شک وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ پھر اس سے (جاکر) نرمی سے باتیں کروتا کہ وہ نصیحت مان لے یا ڈرجائے۔

دعوت حق صرف نیک افراد کے لئے مخصوص نہیں بلکہ برے لوگوں کو بھی دعوت دینا چاہئے ممکن ہے وہ حق کی جانب مائل ہوجائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلطان روم اور بادشاہ ایران کے نام جو خط روانہ کئے تھے۔ ان میں آنحضرتؐ بارہا اس جملہ کو بار بار لکھواتے رہے (**اَدْعوکَ بِدعایة الاسلام**) ''ہم تم کو تبلیغ اسلام کی دعوت دیتے ہیں'' اس کا مطلب ہر شخص تک پیغام اسلام پہنچانا تھا۔

اسی طرح تبلیغ اسلام کے لئے دنیا کے گوشے گوشے میں مبلغین روانہ ہوئے، ان میں سے وہ پہلا گروہ پہلے دعوت حق کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پیغمبر اسلام کی طرف سے بھیجا گیا، یہ تھا:

نام ملک

عبداللہ بن حذافۃ السہمی : ایران بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی۔

حاطب بن ابی بلیغہ: مصر میں ''مقوقس'' کو دعوت اسلام دینے کے لئے رسولؐ اللہ کے ایلچی۔

دحیۃ الکلبی: روم بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی

عمر بن امیہ: حبشہ بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی

سلیط بن عمرو: یمامہ بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی

عمر بن العاص: عمان بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی

حرملہ بن زید: ایک وفد کی معیت میں ''ایلہ'' (جو بحر احمر کے ساحلی علاقے میں واقع ہے) بھیجے گئے ایلچی۔

المھاجر بن ابی امیۃ: حمیر کے بادشاہوں کی طرف بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی۔

خالد بن ولید: ھمدان بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی

علی بن ابی طالبؑ: ھمدان بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے دوسرے ایلچی۔

حذیفہ بن الیمان: ہندوستان بھیجے گئے اسلام کے ایلچی۔

عبداللہ بن عوسجہ: قبیلۂ حارثہ بن قریظ کی طرف بھیجے گئے رسولؐ اللہ کے ایلچی۔

جریر بن عبداللہ البجلّی : ذی الکلام حمیری، قبائل کی طرف بھیجے گئے۔

ان کے علاوہ اور بھی افراد تھے جو مختلف قوموں تک اسلام کا پیغام لے گئے۔

اگر ہم مذکورہ سیاسی اصول کے اثر کو بین الاقوامی تعلقات کے دائرے میں پرکھنا چاہیں تو ان ایلچیوں کے انداز بیان، بین الاقوامی اجتماعات میں فرستادہ تجاویز اور توضیح حقائق کے اسلوب کو سمعی و بصری وسائل کے ذریعہ دیکھ سکتے ہیں۔

لیکن جو خصوصیت اسلام کی بین الاقوامی تعلقات میں خاص طور پر موجود ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام آگاہی اور بیداری کو ہر چیز سے پہلے مدنظر رکھتا ہے۔ اس کے بعد سیاسی، فوجی یا دوسرے قسم کے تعلقات قائم کرتا ہے۔

موجودہ زمانے کے بین الاقوامی تعلقات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تعلقات محض جعلی سیاست پر قائم ہیں، اس لئے کہ اس میں وقت کے تقاضے کے مطابق حقائق اور معیار بدل جاتے ہیں۔

۵۔ رفتار وسلوک میں عدل وانصاف کی رعایت:

درحقیقت اسلامی تصور کا بنیادی محور عدل وانصاف ہے۔

''شَھِدَ اللہ انه لَا اِلٰه الّا ھو وَالْمَلٰئِکَةِ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائماً بِالْقِسْطِ'' (آل عمران:۱۸)

خدا نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور تمام فرشتوں نے اور صاحبان علم (انبیاء واولیاء) جو عدل پر قائم ہیں۔ (یہی شہادت دی ہے)

اور معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ سلوک ورفتار میں بھی عدل وانصاف بنیادی محور کی حیثیت

رکھتا ہے۔

''یا اَیُّھا الَّذینَ آمَنوا کُونُوا قَوّامِینَ بِالْقِسطِ، شُھَدآءِ لِلّٰہ'' (النساء:۱۳۵)

اے ایمان لانے والو، مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لئے گواہی دو۔

فطری بات ہے کہ عدل وانصاف قائم کرنے پر زور اسی وقت دیا جاتا ہے جب بغض دشمنی اور کینہ پردازی کا دور دورہ ہو اور انصاف باقی نہ رہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

''ولا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَومٍ عَلٰی اَن لّا تَعْدِلُوا، اِعْدِلُوا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْویٰ۔'' (المائدہ:۸)

اور تمھیں کسی قبیلہ کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو (خبردار) بلکہ تم (ہر حال میں) انصاف کرو یہی پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔

دوسروں کے ساتھ اسلام کے برتاؤ اور سلوک کا جائزہ لے کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اپنے اصول میں انسانی پہلو سے بے خبر نہیں، یہی نہیں، جہاد، معاہدات میں بھی اسلام اسی پر زور دیتا ہے کہ عدل وانصاف کا لحاظ رکھا جائے۔ یہ امر اس بات کی نشان دہی ہے کہ اسلامی حکومت دنیا کے محروم ومستضعف افراد کی حمایت اور ہر جگہ ظلم وطغیان سے مقابلہ کرتی ہے، خواہ براہ راست اسے نقصان نہ بھی پہنچتا ہو، اسلامی حکومت ظالم حکومتوں کے تعلقات سے بچتی ہے۔ مستضعفین ومحروم افراد کی ہماری حمایت کسی غرض یا پروپگنڈے کی بنا پر نہیں ہے اور نہ یہ بات ہمیں زیب دیتی ہے کہ جب تک ہماری حکومت باقی رہے اور ان لوگوں سے کام نکلتا رہے، ہم حمایت کرتے اور ظلم ڈھاتے رہیں۔ یہ ہمارا نہیں، مشرقی، ومغربی سامراج کا شیوہ ہے۔

ہمارا موقف اسلامی اصولوں پر استوار ہے اور ہمیں اسی پر عمل کرنا ہے اور اس موقف سے جب بھی انحراف کریں گے تو ہمارا شمار بھی ان مستکبروں کی فہرست میں ہوگا جن کے بارے میں باری تعالیٰ فرماتا ہے:

''فَھَلْ عَسَیْتُم اِنْ تَوَلَّیْتُم اَن تُفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوا اَرْحَامَکم اُولٰئک الَّذین لَعَنَھُمُ اللّٰہ فَاَصَمَّھُمْ وَاَعْمیٰ اَبْصَارَھُمْ'' (محمد:۲۲-۲۳)

(منافقو!) کیا تم سے بعید ہے، کہ اگر تم حاکم بنو تو روئے زمین میں فساد پھیلانے اور اپنے رشتے ناتوں کو توڑنے لگو، یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور (گویا خود اس نے) ان کے (کانوں) کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا ہے اس کے برعکس قرآن مجید تو مسلمانوں کی صلاحیتوں کا تعارف کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

''الَّذینَ اِنْ مَکّنَاھُم فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلاۃ واٰتَوا الزَّکوۃ وَاَمَروا بِالْمَعروفِ وَنھوا عَنِ الْمُنکرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔'' (حج:۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں روئے زمین پر قابو دے دیں تو (بھی) یہ لوگ پابندی سے نمازیں ادا کریں گے، زکات دیں گے اور اچھے اچھے کاموں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے لوگوں کو روکیں گے، اور یوں تو سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ (جاری)

مناجاتِ شعبان

آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ

شعبان کے مہینے میں کیا آپ نے مناجاتِ شعبانیہ کے ذریعہ (کہ جس کے پڑھنے کا حکم اس مہینے کی پہلی تاریخ سے آخری تاریخ تک ہے) خداوند تبارک وتعالیٰ کی مناجات کی اور اس کے سبق آموز بلند پایہ مضامین سے مقام ربوبیت کی نسبت اپنے ایمان ومعرفت میں اضافہ کیا؟

مناجاة مولانا امیر المومنین علیه السلام وهی مناجاة الائمه من ولده علیهم السلام کانوا یدعون بها فی شهر شعبان روایة ابن خالویه۔

(بحار الانوار، ج۱۹ جزدوم چاپ قدیم، باب الادعیہ والمناجات، ص۹۰۸۹-)

(رحمة اللّٰهِ) اَللّٰهُمَّ صَلی عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَاسمَعْ دُعٰائِ اِذٰا دَعَوْتُکَ وَاسمَعْ نِدٰائِ اِذٰا نٰادَیْتُکَ اِلٰهی اَنَا عَبدُکَ الضَّعیفُ المُذْنِبُ وَمَملُوکُکَ المُنِیبُ (المَعِیبُ) فَلاٰ تَجْعَلْنی مِمَّنْ صَرَفْتَ عَنْهُ وَجْهَکَ وَحَجَبَهُ سَهْوُهُ عَنْ عَفوِکَ۔

اِلٰهی هَبْ لی کَمَالَ الاِنْقِطٰاعِ اِلَیْکَ وَاَنِرْ اَبْصٰارَ قُلُوبِنٰا بِضِیٰائِ نَظَرِهٰا اِلَیْکَ حَتّیٰ تَخْرِقَ اَبْصٰارُ الْقُلُوبِ حُجُبَ النُّورِ فَتَصِلَ اِلٰی مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ وَتَصِیرَ اَرْوٰاحُنٰا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِکَ۔

اِلٰهی وَاجْعَلْنی مِمَّنْ نٰادَیْتَهُ فَاَجٰابَکَ وَلاٰحَظْتَهُ فَصَعِقَ لِجَلاٰلِکَ فَنٰاجَیْتَهُ سِرّاً وَعَمِلَ لَکَ جَهْرًا۔

اِلٰهی لَمْ اُسَلِّطَ عَلیٰ حُسْنِ ظَنّی قُنُوطَ الأَیاسِ، وَلَاانْقَطَعَ رَجٰائی مِنْ جَمیلِ کَرَمِکَ۔

اِلٰهی اِنْ کَانَتِ الخَطٰایا قَدْ اَسقَطَتْنی لَدَیْکَ فَاصْفَحْ عَنّی بِحُسْنِ تَوَکُّلی عَلَیْکَ۔

اِلٰهی اِنْ حَطَّتَنیَ الذُّنُوبُ مِنْ مَکٰارِمِ لُطْفِکَ فَقَدْ نَبَّهَنِیَ الْیَقِینُ اِلٰی کَرَمِ عَفْوِکَ۔

اِلٰهی اِنْ اَنٰامَتْنِی الْغَفْلَةُ عَنِ الاِستِعْدٰادِ لِلِقٰائِکَ فَقَدْ نَبَّهَتْنیِ الْمَعْرِفَةُ بِکَرَمِ اٰلاٰئِکَ۔

اِلٰهی اِنْ دَعٰانی اِلَی النّٰارِ عَظِیمُ عِقٰابِکَ فَقَدْ دَعٰانی اِلَی الجَنّةِ جَزِیلُ ثَوٰابِکَ۔

اِلٰهی فَلَکَ اَسئَلُ وَاِلَیْکَ اَبْتَهِلُ وَاَرْغَبُ وَاَسئَلُکَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَاَنْ تَجْعَلَنی مِمَّنْ یُدیمُ ذِکْرَکَ وَلاٰ یَنْقُضُ عَهْدَکَ وَلاٰ یَغْفُلُ عَنْ شُکْرِکَ وَلاٰ یَستَخِفُّ بِاَمْرِکَ۔

اِلٰهی وَاَلْحِقْنی بِنُورِ عِزِّکَ الأَبْهَجَ فَأَکُونَ لَکَ عٰارِفًا وَعَنْ سِوٰاکَ مُنْحَرِفًا وَمِنْکَ خٰائِفًا مُرٰاقِبًا، یٰاذَا الجَلاٰلِ وَالاِکْرٰامِ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی مُحَمَّدٍ

رَسُوْلِهٖ وَ اٰلِهِ الطّٰاهِرِیْنَ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا۔

ترجمہ:

امیرالمومنینؑ کے مناجات وہ ہیں کہ جو ان کے فرندوں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ آپ شعبان کے مہینے میں انھیں پڑھتے تھے اور بہ روایت ابنِ خالویہ رحمت اللہ علیہ اس کی عبارت اور اس کا مضمون یہ ہے :

پروردگار درود بھیج محمدؐ اور اس کی آل پر اور میری پکار کو سُن جب میں تجھے پکاروں، اور میری آواز کو سُن جب میں تجھے آواز دوں ۔۔۔۔۔ پروردگار! میں تیرا ایک ضعیف اور گنہگار بندہ ہوں، میں تیرا ایک بھٹکا ہوا عبد ہوں تو مجھے ان لوگوں میں قرار نہ دے جن سے تو نے اپنا منہ موڑ لیا ہے اور ان لوگوں میں بھی میرا شمار نہ کر کہ جن کا سہو واشتباہ تیری عفو درگزر کے آگے حجاب بن گیا ہے۔

پروردگار! مجھے توفیق عنایت فرما کہ میں مکمل طور پر سب سے کٹ کر تیرا ہو جاؤں اور ہمارے دِلوں کی آنکھوں کو اپنے دیدار کی روشنی سے منوّر فرما تا کہ ہمارے دِلوں کی آنکھیں نور کے پردوں کو چیرتی ہوئی معدن عظمت تک پہنچیں اور ہماری روحیں تیرے عزتِ قدس سے ملحق ہو جائیں۔

پروردگار! تو مجھے ان لوگوں میں قرار دے کہ جب تو نے انھیں آواز دی تو انھوں نے لبیک کہا اور جب تو نے ان پر نگاہ کی تو تیرے جلال سے زمین پر گر پڑے۔ تو نے انھیں خفا میں در پردہ آواز دی اور انھوں نے آشکارا تیرے لئے عمل کیا۔

پروردگار! میرے حسن گمان پر مایوسی کی بدبختی کو مسلط نہ فرما اور میری امید کو اپنے بہترین کرم سے منقطع نہ فرما۔

پروردگار! اگر خطائیں تیری بارگاہ میں میرے سقوط کا سبب بنی ہیں تو اس بھروسہ اور توکل کی خوبی کے سبب درگزر فرما جو مجھے تجھ سے ہے۔

پروردگار! اگرچہ گناہوں نے مجھے تیرے کرم سے دور کر دیا لیکن تیرے کرم عفو کے یقین نے مجھے بیداری بخشی ہے۔

پروردگار! اگرچہ غفلت نے تجھ سے ملاقات کے لئے آمادگی سے مجھے باز رکھا تاہم تیرے نعمتوں کی شناخت نے مجھے بیدار کیا ہے۔

پروردگار! اگرچہ تیرا عذاب مجھے ایک انتہائی ہولناک آگ کی طرف بلا رہا ہے لیکن تیرا بے شمار ثواب مجھے بہشت کی طرف آواز دے رہا ہے۔

پروردگار! میں تجھ سے مانگتا ہوں اور تجھ سے اظہارِ ذوق وشوق کرتا ہوں اور تجھ سے چاہتا ہوں کہ تو محمدؐ اور اس کی آل پر درود بھیج اور مجھے ان لوگوں میں قرار دے جن کے لبوں پر ہمیشہ تیرا ذکر رہتا ہے، جو تیرے عہد کو نہیں توڑتے، تیرے شکر سے غفلت نہیں برتتے اور تیرے اَمر کو کمتر نہیں سمجھتے۔

پروردگار! مجھے اپنی عزت کے درخشاں نور تک پہنچا تا کہ میں تیرا شناسا اور تیرے غیر سے روگرداں رہوں، تیرا خوف میرے دِل پر چھایا رہے اور میں تیرا نظارہ کرتا رہوں اے صاحب جلال واکرام۔

پروردگار! اپنے رسول محمدؐ اور اس کے پاکیزہ خاندان پر درود وسلام بھیج۔

تمام ائمہ طاہرینؑ خدائے ذوالجلال کو ان مناجات کے ذریعہ پکارتے تھے۔ حالانکہ بہت کم دعائیں اور مناجاتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں یہ آیا ہو کہ تمام ائمہ طاہرین علیہم السلام انھیں پڑھتے تھے اور خدا کی بارگاہ میں عجز وانکساری کے کلمات پیش کرتے تھے۔

یہ مناجات درحقیقت مقدمہ اور تمہید ہیں تاکہ انسان ماہِ رمضان کے وظائف وفرائض کی پذیرائی کے لئے تیار اور آمادہ ہوجائے۔ شاید اس لئے بھی ہو کہ باخبر انسان کی باخبر اور ملتفت ماہیت کو روزے کے لئے اُکسایا جائے اور اس کے خوش آئند ثمر اور نتائج یاد دلائے جائیں۔ ائمہ طاہرینؑ نے بہت سے مسئلوں اور سوالوں کا حل اپنی عطا کردہ دعاؤں میں ظاہر کیا ان دعاؤں کی زبان اور دوسری عام زبان (جس میں وہ مسائل بیان کیا کرتے تھے) میں بہت فرق ہے اکثر اوقات روحانی، ماوراءطبیعات، دقیق مسائل اور دیگر امور جو معرفتِ خدا سے مربوط ہیں دعا کے لب ولہجہ میں بیان فرماتے تھے ہم ان دعاؤں کو آخر تک پڑھ جاتے ہیں لیکن افسوس کہ ان کے اصل مطالب ومفاہیم کی طرف دھیان نہیں دیتے اور اصولی طور پر سمجھ نہیں پاتے کہ ہمارے معصوم امامؑ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اُن مناجات میں ہم پڑھتے ہیں:

''اِلٰھِی ھَبْ لِی کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ وَاَنِرْ اَبْصَارَ قُلُوْبِنَا بِضِیَاءِ نَظَرِھَا اِلَیْکَ حَتّٰی تَخْرِقَ اَبْصَارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ، فَتَصِلَ اِلٰی مَعْدَنِ الْعَظَمَۃِ وَتَصِیْرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَۃً بِعِزِّ قُدْسِکَ۔''

خدایا نفسِ امّارہ جو مارشل لاء حاکم کی طرح ہے اس کی پیروی سے ہمیں بچائے رکھ۔ ہوا وہوس اور خواہشاتِ نفسانی سے سروکار نہ ہو اور ہمارے دلوں کی آنکھوں کو اُس روشنی کے ساتھ منوّر کردے۔ جس سے ہم تیری طرف دیکھ سکیں تاکہ یہ آنکھیں نور کے ذریعہ معدن عظمت تک پہنچ جائیں اور ہماری ارواح تیری بارگاہِ اقدس میں عزت کے ساتھ باقی رہیں۔

یہ جملہ کہ خدایا مجھے اپنی طرف کمال انقطاع عطا فرما شاید اس مفہوم کو بیان کرتا ہے کہ باخبر اللہ والے لوگ مبارک ماہِ رمضان کے آنے سے پہلے اپنے آپ کو اس روزے کے لئے آمادہ اور تیار کرلیں جو حقیقت میں انقطاع اور لذّاتِ دنیا سے اجتناب کرنا سکھاتا ہے، (اور یہ اجتناب پورے طور پر انقطاع الی اللہ ہے) لیکن مکمل انقطاع آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے تمرین ومشقت، ریاضت، استقامت اور فوق العادۃ مماثلت کی ضرورت ہے، تب کہیں جاکر تمام قویٰ کے ساتھ غیر خدا سے تعلق اور توجہ ہٹا سکتا ہے۔ تمام عمدہ انسانی صفات غیراللہ کی طرف سے پورے طور پر کٹ جانے اور خداوندتعالیٰ سے رشتہ جوڑنے ہی میں پوشیدہ ہیں۔ اگر کوئی شخص اس پر دسترس حاصل کرلے تو وہ سعادتِ عظمٰی پر فائز ہوجائے گا۔ لیکن اگر تھوڑی سی توجہ بھی دنیا کی طرف رہی تو محال ہے کہ انقطاع الی اللہ حاصل ہو جو شخص چاہتا ہے کہ ماہِ رمضان المبارک کے روزے ان آداب کے ساتھ بجالائے جو اس سے مطلوب ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مکمل انقطاع الی اللہ رکھتا ہو تب ہی وہ مراسم وآدابِ مہمانی کو بجالاسکتا ہے اور میزبان کے مقام ومنزلت سے بقدر امکان معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

☆☆☆

حضرت امام حسینؑ

صدر المحققین سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

ولادت: ۳رشعبان ۴ھ
شہادت: ۱۰رمحرم ۶۱ھ

انسانی زندگی کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا پڑتا ہے ایک طرف اسے اپنے انسانیت کے بلند خدو خال کو قائم رکھنے کے لئے خود اپنی نفسانی خواہشوں، حیوانی جذبوں اور جسمانی تقاضوں سے عقل کی رہنمائی اور فرض شناسی کے اصول کی پابندیوں کی خاطر جنگ کرنا پڑتی ہے۔ دوسری طرف سچائی کے راستے میں جو بیرونی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے مقابلے کی ضرورت ہے۔ ماحول، رفتارزمانہ، ظلم اور تشدد کی طاقتیں اس کو اکثر راستے سے ہٹا دینے میں سیلاب کے بہاؤ اور آندھیوں کے تیز جھکڑوں اور طوفان کے سخت تھپیڑوں سے دوچار کر دیتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر سختی کے ساتھ سچائی کے راستے پر قائم رہنا، جان پر کھیل جانا اور اصول سے بال بھر نہ ہٹنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ لفظی طور پر ثابت قدمی، استقلال، ضبط، صبر اور تحمل کی لفظیں اخلاق کی کتابوں اور حکیموں کی نصیحتوں میں بہت مل جائیں گی مگر مشکل منزلوں اور دشوار راستوں میں انسان کا قدم آگے بڑھانے، حوصلے کو قائم رکھنے اور ڈگمگاتے ہوئے پیروں میں استقلال پیدا کرنے کے لئے ایک عملی نمونہ کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے راہنما کی حاجت ہے جو ایسی سخت سے سخت منزلوں کو طے کئے ہوئے، اس آزمائش کی کڑیوں کو جھیلے ہوئے، مشکلات کی گھاٹیوں اور ناہموار راہوں کو روندے ہوئے، کامیابی کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑا ہوا دنیا کو آواز دے رہا ہو کہ: ''آؤ اور میرے نقش قدم پر چل کر سچائی، حقانیت اور صبر واستقلال کی اس معراج کو حاصل کرو۔'' یہ ہیں شہید کربلا حسینؑ ابن علیؑ، جن کے حالات کا ایک مختصر خاکہ اس مضمون میں پیش کیا جارہا ہے۔

نام ونسب: حضرت ابوعبداللہ الحسینؑ جو آل رسولؐ میں سے تیسرے امام ہیں۔ پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ کی والدۂ گرامی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ باعزت بیٹی تھیں جن کی تعظیم کو حضرت کھڑے ہوتے تھے۔ جن کو تمام مسلمان حضرت سیدہؑ اور معصومہؑ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جنہیں مسلمان گھروں میں حضرت بی بی کے مقدس نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کا نام حضرت فاطمہ زہراؑ تھا اور رسولؐ نے سیدۂ زنانِ عالم کا انھیں خطاب دیا تھا۔ ایسے باپ اور ماں کے بیٹے اور ایسے نانا کے نواسے حسینؑ تھے۔ جنہیں روحانی کمالات اپنے نانا، باپ اور ماں سے میراث میں ملے تھے۔

ولادت: ہجرت کے چوتھے سال تیسری شعبان پنجشنبہ کے دن امام حسینؑ کی ولادت ہوئی اس خوش خبری کو سُن کر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ بیٹے کو گود

میں لیا پیار کیا داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منھ میں دے دی۔ پیغمبرؐ کا مقدس لعاب دہن حسینؑ کی غذا بنا۔ ساتویں دن عقیقہ کیا گیا آپ کی پیدائش سے تمام خاندان میں خوشی اور مسرت محسوس کی جاتی تھی مگر آنے والے حالات کا علم پیغمبرؐ کی آنکھوں سے آنسو برساتا تھا۔ اور اسی وقت سے حسینؑ کے مصائب کا چرچا اہلبیتؑ رسولؐ کی زبانوں پر آنے لگا۔

نشوونما: پیغمبر اسلامؐ کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی۔ اب ان دو بچوں کی پرورش میں مصروف ہوئی۔ ایک حسنؑ دوسرے حسینؑ۔ اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا ایک ہی گہوارہ تھا۔ جس میں دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔ ایک طرف پیغمبر اسلام جن کی زندگی کا مقصد ہی اخلاق انسانی کی تکمیل تھی اور دوسری طرف حضرت امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالب جو اپنے عمل سے خدا کی مرضی کے خریدار بن چکے تھے۔ تیسری طرف حضرت فاطمہ زہراؑ جو خواتین کے طبقہ میں پیغمبرؐ کی رسالت کو عملی طور پر پہونچانے ہی کے لئے قدرت کی طرف سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نورانی ماحول میں حسینؑ کی پرورش ہوئی۔

رسولؐ کی محبت: حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں نواسوں کے ساتھ انتہائی محبت فرماتے تھے۔ سینہ پر بٹھاتے تھے، کاندھوں پر چڑھاتے تھے اور مسلمانوں کو تاکید فرماتے تھے کہ ان سے محبت رکھو مگر چھوٹے نواسے کے ساتھ آپ کی محبت کے انداز کچھ امتیاز خاص رکھتے تھے۔ ایسا ہوا ہے کہ نماز میں سجدہ کی حالت میں حسینؑ پشت مبارک پر آگئے تو سجدہ میں طول دیا۔ یہاں تک کہ بچہ خود سے بہ خوشی پشت پر سے علاحدہ ہو گیا اس وقت سر سجدے سے اٹھایا۔ کبھی خطبہ پڑھتے ہوئے اور حسینؑ مسجد کے دروازے سے داخل ہونے لگے اور زمین پر گر گئے تو رسولؐ نے اپنا خطبہ قطع کر دیا اور منبر سے اتر کر بچے کو زمین سے اُٹھایا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ''دیکھو یہ حسینؑ ہے اسے خوب پہچان لو اور اس کی فضیلت کو یاد رکھو۔'' رسولؐ نے حسینؑ کے لئے یہ الفاظ بھی خاص طور پر فرمائے تھے کہ ''حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔'' مستقبل نے بتا دیا کہ رسولؐ کا مطلب یہ تھا کہ میرا نام اور میرا کام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔

رسولؐ کی وفات کے بعد: امام حسینؑ کی عمر ابھی ۶ سال کی تھی جب انتہائی محبت کرنے والے نانا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اب پچیس برس تک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی خانہ نشینی کا دور ہے اس زمانہ کے طرح طرح کے ناگوار حالات امام حسینؑ دیکھتے رہے اور اپنے والد بزرگوار کی سیرت کا بھی مطالعہ فرماتے رہے۔ یہ ہی وہ دور تھا جس میں آپ نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا اور بھرپور شباب کی منزلوں کو طے کیا۔ ۳۵ھ میں جب حسینؑ کی عمر ۳۱ برس کی تھی عام مسلمانوں نے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو بحیثیت خلیفہ اسلام تسلیم کیا۔ یہ امیرالمومنینؑ کی زندگی کے آخری پانچ سال تھے۔ جن میں جمل اور صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور امام حسینؑ ان میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی نصرت اور حمایت میں شریک ہوئے اور شجاعت کے جوہر

بھی دکھائے۔ ۴۰ھ میں جناب امیرؑ مسجد کوفہ میں شہید ہوئے اور اب امامت وخلافت کی ذمہ داریاں امام حسنؑ کے سپرد ہوئیں جو حضرت امام حسینؑ کے بڑے بھائی تھے۔ حسینؑ نے ایک باوفا اور اطاعت شعار بھائی کی طرح حسنؑ کا ساتھ دیا اور جب امام حسنؑ نے ایسے شرائط کے ماتحت جن سے اسلامی مفاد محفوظ رہ سکے معاویہ کے ساتھ صلح کر لی تو امام حسینؑ بھی اس مصالحت پر راضی ہو گئے اور خاموشی کی زندگی گذارنے لگے دس برس تک امام حسنؑ کی زندگی میں اور دس برس تک امام حسنؑ کے بعد آپ خاموشی اور گوشہ نشینی کے ساتھ عبادت اور شریعت کی تعلیم واشاعت میں مصروف رہے مگر معاویہ نے ان شرائط کو جو امام حسنؑ کے ساتھ ہوئے تھے بالکل پورا نہ کیا۔ خود امام حسنؑ کو امیر شام کی سازش ہی سے زہر دیا گیا حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے شیعوں کو چن چن کر قید کیا گیا۔ سر قلم کئے گئے اور سولی پر چڑھایا گیا اور سب سے آخر میں اس شرط کے بالکل خلاف کہ ''معاویہ کو اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا'' معاویہ نے یزید کو اپنے بعد کے لئے ولی عہد بنا دیا اور تمام مسلمانوں سے اس کی بیعت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور زور و زر دونوں طاقتوں کو کام میں لا کر دنیائے اسلام کے بڑے حصے کا سر جھکوا دیا گیا۔

اخلاق واوصاف: امام حسینؑ سلسلۂ امامت کی تیسری فرد تھے۔ عصمت وطہارت کا مجسمہ تھے آپ کی عبادت، آپ کے زہد، آپ کی سخاوت، آپ کے کمالِ اخلاق کے دوست ودشمن سب ہی قائل تھے۔ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اور اکثر روزے رکھتے تھے۔ ۲۵ رحج آپ نے پاپیادہ کئے آپ میں سخاوت وشجاعت کی صفت کو خود رسول اللہ نے بچپنے میں ایسا نمایاں پایا کہ فرمایا: ''حسینؑ میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے۔'' چنانچہ آپ کے دروازے پر مسافروں اور حاجت مندوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا تھا اور کوئی سائل محروم واپس نہیں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا لقب ''ابوالمساکین'' ہو گیا تھا۔ راتوں کو روٹیوں اور کھجوروں کے پشتارے اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ اور غریب، محتاج، بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہنچاتے تھے۔ جن کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے تھے۔ حضرت ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ: ''جب کسی صاحب ضرورت نے تمہارے سامنے سوال کے لئے ہاتھ پھیلا دیا تو گویا اس نے اپنی عزت تمہارے ہاتھ بیچ ڈالی اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو کم سے کم اپنی ہی عزت نفس کا خیال کرو۔''

غلاموں اور کنیزون کے ساتھ آپ عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے ذرا ذرا سی بات پر آپ انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ آپ کے علمی کمالات کے سامنے دنیا کا سر جھکا ہوا تھا۔ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کی جاتی تھی۔ آپ کی دعاؤں کا ایک مجموعہ صحیفۂ حسینیہ کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے آپ رحم دل ایسے تھے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ ان تمام بلند صفات کے

ساتھ متواضع اور منکسر ایسے تھے کہ راستے میں چند مساکین بیٹھے ہوئے اپنے بھیک کے ٹکڑے کھا رہے تھے اور آپ کو پکار کر کھانے میں شرکت کی دعوت دی تو حضرت فوراً ازمین پر بیٹھ گئے اگر چہ کھانے میں شرکت نہیں فرمائی۔ اس بنا پر کہ صدقہ آل محمدؐ پر حرام ہے۔ مگر ان کے پاس بیٹھنے میں کوئی عذر نہیں ہوا۔

اس خاکساری کے باوجود آپ کی بلندی مرتبہ کا یہ اثر تھا کہ جس مجمع میں آپ تشریف فرما ہوتے تھے لوگ نگاہ اُٹھا کر بات نہیں کرتے تھے جو لوگ آپ کے خاندان کے مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت امام حسینؑ نے امیر شام معاویہ کو ایک سخت خط لکھا جس میں ان کے اعمال وافعال اور سیاسی حرکات پر نکتہ چینی کی تھی اس خط کو پڑھ کر معاویہ کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ پاس بیٹھنے والے خوشامدیوں نے کہا کہ آپ بھی اتنا ہی سخت خط لکھئے۔ معاویہ نے کہا میں جو کچھ لکھوں وہ اگر غلط ہو تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو بخدا حسینؑ میں مجھے ڈھونڈھے سے کوئی عیب نہیں ملتا۔

آپ کی اخلاقی جرات، راست بازی اور راست کرداری، قوت اقدام، جوش عمل اور ثبات واستقلال، صبر وبرداشت کی تصویریں کربلا کے مرقع میں محفوظ ہیں۔ اس سب کے ساتھ آپ کی امن پسندی یہ تھی کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی کوشش جاری رکھی مگر عزم وہ تھا کہ جان دے دی جو صحیح راستہ پہلے دن اختیار کر لیا تھا اس سے ایک انچ نہ ہٹے انھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہوکر بھائی کی اطاعت کی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ اپنے وقت میں وہ اطاعت بھی بے مثل اور دوسرے وقت میں یہ قیادت بھی لاجواب تھی۔

واقعۂ کربلا: حضرت امام حسنؑ سے اور امیر شام معاویہ ابن ابی سفیان سے جو صلح ہوئی تھی اس کی ایک خاص اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا مگر سب شرطوں کو عملی طور پر پائمال کرتے ہوئے معاویہ نے اس شرط کی بھی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد کے لئے نامزد کرنا کیسا بلکہ اپنی زندگی ہی میں ممالک اسلامیہ کا دورہ کر کے بحیثیت آئندہ خلیفہ کے یزید کی بیعت حاصل کر لی۔ اس وقت حضرت امام حسینؑ نے بیعت سے انکار فرمادیا۔ امیر شام نے آپ کو موافق بنانے میں ہر طرح کی کوشش کی مگر نتیجہ میں ناکامیابی ہوئی۔ یزید نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اس کی خلافت ناجائز تھی بلکہ اپنے اخلاق، اوصاف اور کردار کے لحاظ سے اتنا پست تھا کہ تخت سلطنت پر اس کا برقرار ہونا اسلامی شریعت کے لئے سخت خطرے کا باعث تھا۔ وہ شراب خوار، بدکار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب تھا جن کا ذکر بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے، اس پر طرّہ یہ کہ وہ حضرت امام حسینؑ سے بیعت لینے پر مصر تھا، گویا وہ اپنے خلاف شریعت افعال کی

صحت کے لئے پیغمبر اسلامؐ کے نواسے سے سند حاصل کرنا چاہتا تھا۔

معاویہ کے مرنے کے بعد جب یزید تخت پر بیٹھا تو سب سے پہلی فکر اس کو یہ ہی ہوئی کہ حضرت امام حسینؑ سے بیعت حاصل کی جائے اس نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا معاویہ کی خبر انتقال کے ساتھ بیعت کے لئے بھی لکھا۔ ولید نے جو مدینہ کا گورنر تھا امام حسینؑ کو بلا کر یزید کا پیغام پہنچایا۔ آپ پہلے ہی سے یہ طے کئے ہوئے تھے کہ یزید کی بیعت آپ کے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے۔ بیعت نہ کرنے کی صورت میں جو نتائج ہوں گے انھیں بھی خوب جانتے تھے مگر دین خدا کی حفاظت اور شریعت اسلام کی خاطر آپ کو سب گوارا تھا آپ ولید کو مناسب جواب دے کر اپنے مکان پر واپس آئے۔ مدینہ میں قیام اس کے بعد نامناسب خیال فرما کر ہجرت کا مضبوط ارادہ کرلیا۔

۶۰ھ رجب کا مہینہ ۲۸ر تاریخ تھی جب حضرت اپنے نانا کے جوار کو چھوڑ کر ظالموں کے جور وستم سے سفر غربت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ مکہ معظّمہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلامی تعلیمات کی رو سے جائے پناہ اور امن وامان کی جگہ تھی آپ نے مکہ میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے قیام فرمایا۔ آپ کے ساتھ آپ کے قریبی اعزہ تھے جن میں خاندان رسولؐ کی محترم بی بیاں اور کم سن بچے بھی تھے۔ آپ اپنی طرف سے کسی خوں ریزی اور جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ حج کا زمانہ بھی قریب تھا اور حضرت کی دلی تمنا تھی کہ اس سال خانۂ کعبہ کا حج ضرور فرمائیں جب کہ آپ مکہ ہی میں موجود ہیں مگر اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ وہ بزرگوار جو اس کے پہلے ۲۵ر حج خانۂ کعبہ کے اپنے وطن مدینہ سے آکر پا پیادہ بجالا چکا تھا اس وقت مکہ میں موجود ہونے پر بھی حج کرنے سے مجبور ہوگیا۔ ظالم حکومت شام کی طرف سے کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیجے گئے کہ وہ جس حالت میں بھی موقع ملے حضرت امام حسینؑ کو خانۂ کعبہ کے پاس ہی قتل کرڈالیں۔

حضرت نہ چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے مکہ کے اندر خونریزی ہو اور خانۂ کعبہ کی حرمت برباد ہو۔ دو روز حج کو باقی تھے جب آپ تمام اہل وعیال اور اعزہ کے ساتھ مکہ معظّمہ سے روانہ ہوگئے اب آپ کہاں جاتے۔ کوفہ کے لوگ برابر خطوط بھیج رہے تھے کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور ہماری مذہبی رہنمائی فرمائیں جب کہ آپ مکہ سے نکلنے پر مجبور ہوچکے تھے تو اب کوفہ ہی وہ مقام ہوسکتا تھا جس کی طرف آپ رُخ کرتے۔ یہاں کے حالات کو دیکھنے کے لئے آپ اپنے چچازاد بھائی جناب مسلم بن عقیل کو بھیج چکے تھے۔ ۸ر ذی الحجہ کو حضرت مکہ معظّمہ سے کوفہ کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر یہ ہی وہ وقت تھا جب کوفہ میں انقلاب ہوچکا تھا۔ شروع میں تو کوفہ کے لوگوں نے حضرت مسلم کا خیر مقدم کیا اور اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی مگر جب یزید کو اس کی اطلاع ہوئی اس نے حاکم کوفہ نعمان ابن بشیر کو معزول کیا اور ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔

یہ شخص بڑا ہی ظالم اور تشدد پسند تھا اس نے کوفہ میں آکر بڑے سخت احکام نافذ کئے اور تمام اہل کوفہ پر خوف

ودہشت طاری ہوگئی۔ سب نے جناب مسلم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور آخر تن تنہا ہزاروں کا مقابلہ کرنے کے بعد بڑی مظلومی اور بے کسی کے ساتھ ۹رذی الحجہ کو وہ شہید کرڈالے گئے۔ حضرت امام حسینؑ عراق کے راستے میں منزل زبالہ پر تھے جب حضرت کو مسلمؑ کی خبر شہادت معلوم ہوئی۔ اس کا حضرت پر بڑا اثر پڑا مگر عزم واستقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ واپسی کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ذوحسم کی منزل میں ابن زیاد کی فوج میں سے ایک ہزار کا لشکر حُر ابن یزید ریاحی کی سرداری میں آپ کا راستہ روکنے کے لئے پہنچ گیا۔ یہ دشمن کی فوج تھی مگر حضرت امام حسینؑ نے ان کے ساتھ رحم و کرم کا وہ مظاہرہ فرمایا جو دنیائے انسانیت میں یادگار رہے گا۔ تمام فوج کو پیاسا دیکھ کر جتنا پانی ساتھ تھا سب پلا دیا اوران بے آب راستوں میں اپنے اہل حرم اور بچوں کی پیاس کے لحاظ سے پانی کا کوئی ذخیرہ محفوظ نہ رکھا۔ اس کے بعد بھی یزیدی فوج نے اپنے حاکم کی ہدایت کے موافق آپ کے ساتھ تشدد اختیار کیا آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روک دیا اب ۶۱ھ کا پہلا مہینہ شروع ہوگیا تھا۔ دوسری محرم کو حضرت کربلا کی زمین پر پہنچے اور یہیں اترنے پر مجبور ہوگئے۔ دوسرے دن سے یزید کا ٹڈی دَل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہوگیا، اور تمام راستے بند کردئے گئے۔ امام حسینؑ کے ساتھ صرف بہتر جاں باز تھے اوراُدھر ہزاروں کا لشکر۔

سات دن تک امن قائم رکھنے کے لئے صلح کی کوشش ہوتی رہی۔ حضرت یہاں تک تیار ہوئے کہ عرب کا ملک چھوڑ دیں، کسی دور دراز سرزمین پر چلے جائیں اوراس طرح اپنے کو بیعت یزید سے الگ رکھتے ہوئے بھی ایسی صورت پیدا کردیں کہ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مگر نویں محرم کی سہ پہر کو صلح کے امکانات ختم ہوگئے۔ ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجا گیا، اس میں لکھا تھا کہ ''یا حسینؑ غیر مشروط طور پر اطاعت قبول کریں یا ان سے جنگ کی جائے''، اس خط کے پہنچتے ہی فوج یزیدی نے حملہ کردیا۔

باوجودیکہ ساتویں سے پانی بند ہوچکا تھا، امام حسینؑ کے سامنے ان کے اہل حرم اور چھوٹے بچوں کی بے تابی کے مناظر، العطش کی صدائیں اور مستقبل کے حالات سب ہی کچھ تھے۔ مگر یزید کی بیعت اب بھی اسی طرح غیر ممکن تھی جس طرح اس کے پہلے۔ بے شک آپ نے یہ چاہا کہ ایک رات کی مہلت مل جائے، آپ چاہتے تھے کہ یہ پوری رات آخری طور پر عبادت خدا میں بسر کریں۔ اس کے علاوہ دوست ودشمن دونوں کو جنگ کا قطعی فیصلہ ہوجانے کے بعد اپنے اپنے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع مل جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کرکے تقریر فرمائی آپ نے فرمایا: ''کل قربانی کا دن ہے ان ظالموں کو مجھ سے دشمنی ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ تم لوگ بھی اپنی زندگی کو میرے ساتھ خطرے میں ڈالو۔ میں تم سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ۔'' مگر ان جانبازوں نے یک زبان ہوکر کہا کہ ''ہم آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔''

عاشور کی رات ختم ہوئی۔ دسویں محرم کو صبح سے عصر تک کی مدت میں ان بہادروں نے جو کچھ کہا تھا اسے کر کے دکھا دیا۔ اس وفاداری، استقلال اور بہادری کے ساتھ حضرت امام حسینؑ کی نصرت میں دشمنوں سے مقابلہ کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان میں حبیب ابن مظاہر، مسلم ابن عوسجہ، سوید ابن عمر، انس ابن حارث اور عبدالرحمن ابن عبد رب ایسے ساٹھ ستر اور اسی برس کے بوڑھے تھے اور متعدد اصحاب رسول بھی تھے۔ بریر ہمدانی، کنانہ ابن عتیق تغلبی، نافع ابن ہلال، حنظلہ ابن اسعد ایسے حفاظ قرآن تھے اور بہت سے علماء اور راویان حدیث، بہت سے عابد اور شب زندہ دار اور بہت سے ایسے شجاعان روزگار تھے جن کی شجاعت کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔

جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ سب سے پہلے حضرت نے جوان بیٹے علی اکبرؑ کو جو شبیہ پیغمبرؐ بھی تھے مرنے کے لئے بھیج دیا علی اکبرؑ نے جہاد کر کے اپنی جان دین خدا پر نثار کی امام حسینؑ کو شبیہِ رسولؐ کی جدائی کا صدمہ تو بہت ہوا مگر عمل کے راستے میں آپ کی ہمت کے حوصلے اور ولولے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عقیل کی اولاد عبداللہ ابن جعفر کے فرزند ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ امام حسنؑ کے یتیم قاسمؑ کی جدائی آپ کو بہت شاق ہوئی۔ مگر اپنے بزرگ مرتبہ بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے قاسمؑ کو بھی رخصت کر دیا۔

سب کے آخر میں فرزندان امیرالمومنینؑ میدان جہاد میں گئے جب کوئی نہ رہا تو علمدارؑ کی باری آ گئی۔ قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ کو حضرت کسی طرح اجازت جہاد نہ دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کے کاندھوں پر اسلام کا علم لہرا رہا تھا۔ مگر آخر ایک طرف بچوں کی پیاس دوسری طرف جوش جہاد۔ عباسؑ پانی لینے کے لئے ایک مشک اپنے ساتھ لے کر فرات کی جانب متوجہ ہوئے انھوں نے علم کی حفاظت بھی کی۔ دشمنوں سے مقابلہ بھی کیا۔ فوج کو ہٹا کر نہر کا راستہ بھی صاف کیا اور مشک میں پانی بھی بھر لیا۔ مگر افسوس کہ یہ پانی خیام حسینی تک پہنچنے نہیں پایا تھا کہ بہادر علمدار کے شانے قلم ہوئے۔ مشک تیر سے چھدی اور پانی زمین پر بہا عباسؑ کی قوت ختم ہوگئی۔ گُرز کے صدمہ سے زمین کی طرف جھکے اور علم عباسؑ کے ساتھ زمین پر آ گیا۔ حسینؑ کی کمر شکستہ ہوگئی۔ پشت جھک گئی مگر ہمت پھر بھی نہیں ٹوٹی، اب جہاد کے میدان میں حسینؑ کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا مگر فہرست شہداء میں ابھی ایک بے مثال مجاہد کا نام باقی تھا۔ جس کا جواب قربانی کی تاریخ میں نہ پہلے نظر آیا نہ بعد میں نظر آ سکتا ہے۔ یہ چھ مہینے کا بچہ علی اصغرؑ تھا جو گہوارے میں پیاس سے جاں بلب تھا۔ حسینؑ درخیمہ پر تشریف لائے اور اس بچہ کو طلب فرمایا۔ بچے کی عطش اور اس کی حالت کا مشاہدہ فرمایا۔ یقینا یہ منظر ہر حساس انسان کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر کیسے بے رحم تھے وہ سختِ دل فوج شام کے سپاہی جنھوں نے حسین کے ہاتھوں پر اس معصوم بچے کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ رحم کھاتے، بچے کو ایک قطرۂ آب سے سیراب کرتے، ظلم اور شقاوت کا مظاہرہ انتہائی حد تک پہنچا دیا۔ سخت دل حرملہ کا تیر اور بچہ کا نازک گلا۔

امام حسینؑ نے یہ آخری ہدیہ بھی بارگاہ الٰہی میں پیش کردیا تو خود بہ نفس نفیس میدان جہاد میں قدم رکھا اور باوجود اس بے کسی اور شکستگی کے جب کہ یقینا تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے دن بھر اصحاب واعزا کی لاشیں اُٹھائی تھیں اور بہتر داغ سینہ پر کھا چکے تھے۔ بھائی کے غم سے کمر شکستہ تھی اور اولاد کے داغ سے کلیجہ زخمی ہوگیا تھا۔ مگر جب نصرت اسلام کے لئے تلوار نیام سے نکالی تو دنیا کو حمزہؓ اور جعفرؓ کی شان اور حیدرؑ صفدر کی شجاعت یاد دلا دی۔ آخر قربانی کی منزل سامنے آگئی۔ دشمنوں کی تلواریں، نیزے اور تیر اور وہ مقدس جسم، زخموں کی کثرت، خون کے بہنے سے گھوڑے پر سنبھلنے کی طاقت نہ رہی۔ دشمنوں نے ایذا رسانی کی کوئی حسرت باقی نہ رکھی۔ شمر کا خنجر فرزند رسولؐ کے گلے پر کیا پھرا گویا رسولؐ کا سر قلم ہوا۔ اور نام نہاد کلمۂ اسلام پڑھنے والوں نے پیغمبر اسلام کے نواسے کا سر نیزہ پر بلند کیا اتنا ہی نہیں بلکہ خیموں میں آگ لگادی گئی۔ خانوادۂ عصمت کی مقدس بی بیوں کے سروں سے چادریں اتاری گئیں۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں کے سُموں سے پامال کی گئیں۔

امام حسینؑ کے بعد مردوں میں صرف ایک بیمار فرزند سید سجادؑ باقی تھے، جنہیں طوق وزنجیر پہنایا گیا اور بیبیوں اور بچوں کے ساتھ قید کر کے شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام قیدیوں کی صورت سے لے جائے گئے اور ابن زیاد اور یزید کے درباروں میں کھڑے کئے گئے۔

ان نام کے مسلمانوں نے تو پیغمبر اسلامؐ کے فرزند کو دفن وکفن سے بھی محروم رکھا تھا مگر آس پاس کے رہنے والے قبیلۂ بنی اسد کے لوگوں نے فوج ظلم کے چلے جانے کے بعد ۱۲ محرم کو یعنی شہادت سے تیسرے دن دفن کیا۔

آج کربلائے معلّٰی میں حسینؑ کا روضہ انتہائی شان وشوکت کے ساتھ تمام دنیا کے لوگوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور حسینؑ کے نام کا تعزیہ اور ضریح اور علَم اور مختلف مظاہرات دنیا کے ہر گوشے میں نظر آتے ہیں۔ حسینؑ دنیا میں قائم ہیں اور حسینؑ کی بدولت اسلام باقی ہے اور صداقت و استقلال اور حق پرستی کے لئے امام حسینؑ کا اسوۂ حسنہ تاریخ انسانیت میں بے مثال حیثیت سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

اگر واقعۂ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کرے۔ اور سیدالشہداء نے کربلا میں جو بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی جاری رہے تو زندگی کے آثار نمایاں ہوجائیں۔

ہم میں کیا کمی ہے۔ یہی ہے کہ ہم بلند مقاصد کے سامنے اپنے وقتی مفاد، اپنے راحت وآرام، اپنی زندگی، اپنی قرابتوں اور اپنے اہل وعیال اور اولاد اور نہ جانے کتنی روپہلی سنہری مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہیں۔

امام حسینؑ نے یہ مثال پیش کی ہے کہ تم بلند مقاصد کے لئے اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کے لئے تیار رہو۔ مبارک ہوں گے وہ افراد جو اس سے سبق حاصل کریں اور اپنے تئیں عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

☆☆☆

مناجات واستغفار

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

استغفار: توبہ انسان کو حقارت اور ذلت سے نجات بخشتی ہے۔ توبہ دلوں کو پاک کرتی ہے۔ دل یعنی جان یعنی روح یعنی حقیقت انسان۔ دل نہایت نورانی شئ ہے۔ ہر انسان نورانی ہوتا ہے، حتی کہ اگر انسان کا خدا سے رابطہ منقطع ہوجائے تب بھی اس کی ذات اور اس کے جوہر میں نور باقی رہتا ہے۔ صرف ہوتا یہ ہے کہ گناہوں اور ہواوہوس کی بنا پر دل غبار آلودہ ہوجاتا ہے۔ توبہ اس غبار کو صاف کرکے دل کو نورانیت بخشتی ہے۔

توبہ یعنی طلب مغفرت اور گناہوں سے استغفار۔ توبہ اگر اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ کی جائے تو انسان کے اوپر برکات الٰہی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ گناہ ہمارے اور ہمارے پروردگار کے درمیان حجاب کا کام کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اوپر سارے الٰہی دروازے بند ہوجاتے ہیں، نہ رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے نہ ہدایت الٰہی، نہ توفیق الٰہی حاصل ہوتی ہے اور نہ فضل خدا۔ توبہ اس حجاب کو ختم کرنے کا باعث ہوتی ہے اور نتیجۃً رحمت وفضل خدا کا دروازہ ہمارے اوپر کھل جاتا ہے۔ یہ ہیں توبہ کے فائدے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر توبہ کے لئے کبھی دنیاوی اور کبھی اخروی فوائد شمار کرائے گئے ہیں۔ مثلاً: ''وان استغفروا ربکم لم توبوا الیہ۔۔یرسل السماء علیکم مدراراً۔''

توبہ یعنی خدا کی طرف بازگشت۔ یہ ایک اہم ترین نعمت الٰہی ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کے لئے باب توبہ کھول دیا ہے تاکہ اس کے بندے راہ کمال وسعادت میں پیش قدمی کرتے رہیں اور گناہ اس راہ میں مانع نہ ہوسکیں، کیونکہ گناہ انسان کو اس کے اعلیٰ مقام سے پستی میں لاکھڑا کرتا ہے۔ ہر گناہ روح انسان اور معنویت انسان پر ایک ضرب کی مانند ہوتا ہے جس سے روح کی شفافیت مکدر ہوجاتی ہے۔ گناہ کے ذریعے انسان وحیوانات کے درمیان پایا جانے والا فرق ختم ہوجاتا ہے۔

معنوی جنبہ کے علاوہ گناہ انسان کی زندگی میں دوسری بہت سی رکاوٹیں بھی کھڑی کردیتا ہے۔ نہ جانے کتنی کامیابیاں گناہوں کی انجام دہی کی وجہ سے ناکامیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ یہ سب صرف زبانی یا تعبدی باتیں نہیں ہیں بلکہ انہیں علمی، فلسفی اور نفسیاتی طور پر ثابت کیا جاچکا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ احد میں چند مسلمانوں کی کوتاہی اور تقصیر کی بنا پر فتح اوّلیہ، شکست میں تبدیل ہوگئی تھی یعنی مسلمان پہلے مرحلہ میں فتح حاصل کرچکے تھے لیکن ان چند لوگوں کی بنا پر جنہیں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہاڑ کے دروں میں معمور کیا تھا اور انھوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی، مسلمان مشکلات کا شکار ہوگئے تھے۔

رسول اسلامؐ نے حکم دیا تھا کہ مقررہ جگہوں سے مسلمانوں کی حفاظت کریں لیکن یہ لوگ مال غنیمت کے لالچ میں اپنی اپنی کمین گاہوں کو چھوڑ کر میدان میں آگئے اور دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔

سورہ آل عمران میں تقریباً دس یا بارہ آیتیں اسی شکست سے متعلق ہیں۔ چونکہ مسلمان روحانی اعتبار سے نہایت تلاطم اور کشمکش کا شکار تھے لہٰذا یہ شکست ان پر بے حد ناگوار گزری تھی۔ قرآنی آیتیں جہاں ان کے اطمینان قلبی کا باعث ہوتی تھیں وہیں ان کی ہدایت بھی کرتی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی باور کراتی جاتی تھیں کہ اس شکست کی وجہ کیا تھی: ''اِنَّ الذینَ تَوَلَّوا مِنکم یومَ الْتقی الْجمعان اِنَّما اسْتَزَلَّھُم الشَّیطان بِبعضِ ذُنُوبِھِم'' یعنی تم نے دیکھا کہ تم میں سے بعض افراد نے دشمن کو پشت دکھا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہیں شکست ہوگئی۔ یہ لوگ پہلے ہی سے ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کو ان کاموں کی بنا پر جو یہ پہلے بھی انجام دے چکے تھے، شیطان نے باآسانی صراط مستقیم سے منحرف کر دیا یعنی انجام شدہ گناہوں نے اپنا اثر میدان جنگ میں دکھایا۔

اسی مذکورہ سورہ میں ایک دوسری آیت ایک دوسرے انداز سے اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ قرآن کریم درحقیقت کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر تم جنگ احد میں شکست کھا گئے تو یہ کوئی تعجب وحیرانی کی بات نہیں ہے، کیونکہ یہ سب زندگی کے معمولات ہیں۔ تم سے پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے: ''وَ کَاَیِّنْ مِّنْ نَبی قَاتَلَ مَعه رِبِّیُونَ کَثیرٌ فَمَا وَھَنوا لِمَا اَصَابَھُمْ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَکَانُوْا'' قرآن مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم سے پہلے بھی خدا کے نبیوں کو میدان جنگ میں مشکلات وشکست کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن وہ تو ہراساں وپریشاں نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: ''وَمَا کَانَ قَوْلھم اِلَّا اَن قَالُوْا رَبَّنا اغْفِرْلَنَا ذُنُوبَنَا وَاِسْرَافنا فِی اَمْرِنَا'' یعنی گزشتہ زمانوں میں جب اصحاب انبیاء کے حوالی (حالات) مشکلات ومسائل کا شکار ہوتے تھے تو پروردگار کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر کہتے تھے: ''رَبَّنا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنا وَاِسْرَافنا فِی اَمْرِنَا'' پروردگار ہمارے گناہوں اور ہمارے ذریعے کی گئی زیادتیوں اور غفلتوں کو معاف فرما۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مشکلات ومسائل ہمارے ذریعے انجام دیے گئے گناہوں ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے پروردگار کے ذریعے نازل کی گئی اہم ترین نعمت یعنی مغفرت سے استفادہ کریں۔ خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے کوئی قبیح فعل انجام دیا اور اس پر بعد میں پشیمان ہوئے تو تمہارے لئے استغفار اور توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ گناہ کی مثال کسی بیماری یا علالت کی سی ہے۔ انسان بیماری سے بہت کم محفوظ رہ پاتا ہے۔ گناہ بھی ایک مرض کی طرح ہے۔ اگر انسان اس مرض کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ باب توبہ واستغفار کی طرف آئے۔ اگر انسان اس طرف آ گیا تو خداوند عالم اتنا غفار ہے کہ اس گنہگار انسان کو بخش دے گا۔

صحیفہ سجادیہ کی ۴۵ ویں دعا میں امام سجادؑ خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں: ''اَنْتَ الَّذِیْ فَتَحتَ لِعِبَادِکَ بَاباً اِلیٰ عَفْوِکَ'' یعنی تو ہی ہے جس نے اپنے بندوں کی طرف عفوومغفرت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ ''وَسمّیته التوبه'' جس کا نام تو نے باب توبہ رکھا ہے۔ ''وجعلت علی ذالک الباب دلیلاً من وحیک لئلا یضلّوا عنه'' قرآن ووحی سے ایک راہنما بھی اس دروازے پر قرار دے رکھا ہے تا کہ تیرے بندے اس سفر میں منزل سے نہ بھٹک جائیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''فما عذر من اغفل دخول ذالک المنزل بعد فتح الباب لاقامة الدلیل'' یعنی اب اس کے بعد انسان کے لئے کیا دلیل بچتی ہے کہ اس باب توبہ اور مغفرت الٰہی سے فیضیاب نہ ہو۔

راہ مغفرت الٰہی یعنی استغفار

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث منقول ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں: ''انّ اللّٰه تعالیٰ یغفر للمذنبین الا من لا یرید ان یغفر له'' یعنی خداوند عالم گناہگاروں کے گناہوں کو بخش دیتا ہے مگر ان گناہگاروں کے علاوہ جن کو خدا بخشنا نہیں چاہتا؟ ''قال من لا یستغفر'' یعنی وہ جو استغفار نہیں کرتا۔ پس استغفار باب توبہ ومغفرت کی چابی ہے۔ استغفار کے ذریعے ہی مغفرت الٰہی کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

غفلت استغفار کی راہ میں پہلی رکاوٹ ہے

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس نعمت الٰہی یعنی استغفار تک دسترسی حاصل کریں تو ضروری ہے کہ دو صفتوں کو خود سے دور کریں۔ پہلی غفلت و بے توجہی اور دوسری غرور وتکبر۔

غفلت یعنی یہ کہ انسان اصلاً متوجہ ہی نہ ہو کہ اس سے گناہ سرزد ہو رہا ہے۔ ایسے بہت سے افراد پائے جاتے ہیں جو گناہ پر گناہ انجام دیتے جاتے ہیں اور انھیں اپنے اس قبیح فعل کا احساس تک نہیں ہوتا۔ دروغ، غیبت، الزام تراشی وغیرہ اسی طرح کے گناہ ہیں۔ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر انھیں متوجہ بھی کرایا جائے تو تمسخرانہ انداز میں قہقہہ بھی لگاتے ہیں۔ گناہ؟ گناہ یعنی کیا؟ ایسے افراد اصلاً ثواب وعذاب کے ذرہ برابر بھی معتقد نہیں ہوتے۔ بعض دوسرے ثواب وعذاب کے معتقد تو ہوتے ہیں لیکن مکمل طور پر غفلت اور بے توجہی کے اس قدر شکار ہوتے ہیں کہ اپنی ذات سے صادر شدہ فعل کا احساس بھی نہیں کر پاتے۔ اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ذرا سا جھانکنے کی کوشش کریں تو بآسانی واضح ہوجائے گا کہ ہماری زندگی بھی کم وبیش ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتی ہے۔ غفلت ایک بہتر خطرناک شئے ہے۔ شاید انسان کے لئے غفلت سے بڑا دشمن اور خطرناک شئے کوئی نہ ہو۔ غافل انسان کسی بھی قیمت پر استغفار نہیں کرتا ہے اس کی ساری زندگی گناہوں میں بسر ہوجاتی ہے اور اس کو احساس تک نہیں ہو پاتا، فقط خواب غفلت کا شکار ہو کر رہ جاتا اور بس۔ قرآن کریم نے غفلت کے مدمقابل تقویٰ کو پیش کیا ہے۔ تقویٰ یعنی ہمیشہ اور ہر حال میں متوجہ رہنا۔ غافل شخص سینکڑوں گناہ کرنے کے بعد بھی اپنے گناہ کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں متقی وپرہیزگار شخص ہے، جہاں چھوٹا سا گناہ اس سے سرزد ہوا فوراً اپنے گناہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور جلد از جلد اس کی

تلافی کی فکر میں مشغول ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: "اِنَّ الَّذین اتَّقَوْا اِذَا مَسّهم طائفٌ مِّن الشَّیطانِ تَذَکَّرُوا" اگر شیطان متقی افراد کے پاس سے گزر بھی جاتا ہے تو یہ لوگ فوراً متوجہ ہوجاتے ہیں۔ "فَاِذاهُم مُبصرون" ایسے ہی لوگ بابصیرت ہوتے ہیں۔

غرور وتکبر راہ استغفار میں دوسری رکاوٹ ہے

انسان جہاں ذرا سا کوئی چھوٹا سا کام انجام دے لیتا ہے فوراً مغرور ہوجاتا ہے۔ صحیفہ سجادیہ کی ۴۶ ویں دعا میں ایک جملہ ہے: "والشقا الاشقاء لمن اغتربک" یعنی شقی ترین شخص وہ ہے جو تیرے سامنے غرور وتکبر سے پیش آئے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جہاں کوئی کارِ خیر انجام دیا، فوراً یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ہم نے خدا سے اپنا حساب بے باق کر دیا۔ اب ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ زبان تک نہ آئے لیکن دل میں تو بارہا آتا ہے اور یہی غرور ہے۔

خدا نے اگر ہمارے لئے بابِ توبہ فراہم کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کبھی کبھی یہی گناہ انسان کے وجودِ حقیقی کو بھی ضائع کر دیتے ہیں اور اس کو حیاتِ انسانی کے عالی مراتب سے ایک پست ترین حیوان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

ضروری نہیں ہے کہ انسان ایک مدت تک گناہوں میں غرق رہے تب ہی گناہوں کا احساس کر سکتا ہے بلکہ گناہ، گناہ ہے خواہ ایک گناہ ہو یا گناہوں کا انبار۔ گناہ کو قطعاً حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ روایت میں "استحقار الذنوب" کے عنوان سے ایک باب ہے جس کے تحت گناہوں کو حقیر فرض کرنے کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ خدا کے مغفرت کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ گناہوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے لہٰذا وہ معاف کرے گا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے خدا تک واپس آسکتا ہے اور خدا تک برگشت (رجوع) نہایت اہم ہے کہ روایات میں جس کے لئے نہایت تاکید کی گئی ہے۔

بہر حال حقیقتاً وہی استغفار قابلِ ستائش ہے جو حقیقی اور دل کی گہرائیوں سے ہو۔ زبان سے توبہ اور استغفار کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ استغفار کی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے گناہ پر شرمندہ ہو اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا قوی ارادہ رکھتا ہو۔ روایت میں وارد ہوا ہے: "من استغفره بلسانه ولم يندم بقلبه فقد استحضری بنفسه" یعنی جو شخص زبان سے استغفار کرے اور دل سے شرمندہ اور نادم نہ ہو ایسا شخص درحقیقت اپنے نفس کی تضحیک کرتا ہے۔ یہ استغفار نہیں ہے۔ استغفار سے مراد یہ ہے کہ انسان واقعی خداوندِ عالم کی طرف برگشت کرے اور اس کی بارگاہ میں دعا کرے کہ وہ اس کے گناہوں کو بخش دے۔

دعا ایمان کو قوی اور الٰہی وعدوں کو پورا کرتی ہے

دعا انسان کو خدا سے نزدیک کرتی ہے۔ معارفِ دینی کو انسان کے دل میں اثر انداز اور قائم رکھتی ہے۔ دعا ایمان کو قوی کرتی ہے۔ یعنی دعا کئی زاویوں سے برکتوں اور رحمتوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بارہا دعا اور بندگانِ صالح کے ذریعے کی گئی دعاؤں سے

متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ انبیائے الٰہی مسائل ومشکلات کے وقت خدا کی بارگاہ میں دعا کرتے تھے، خدا سے مدد کی التماس کرتے تھے: ''فَدعا ربہ انّی مغلوبٌ فانْتَصِر'' جو حضرت نوحؑ سے منقول شدہ دعا ہے یا حضرت موسیٰ کی زبانی قرآن فرماتا ہے: ''فدعا ربہ اِنّ ھٰولاءِ قوم مُجرِمون''۔

قرآن کریم میں خداوند عالم نے متعدد آیتوں میں دعاؤں کی قبولیت اور استجابت کا وعدہ فرمایا ہے مثلاً: ''وَقالَ رَبُّکم اُدْعُوْنِی اسْتَجِب لکُم'' یعنی تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعاؤں کو مستجاب کروں گا۔ اسی طرح ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''واسئلوا اللہ مِن فَضْلِہ انّ اللہ بِکُلِّ شَئی علیماً'' یعنی اگرچہ خدواند عالم ہے اور ہماری حاجتوں سے آگاہ بھی ہے مگر اس کے باوجود تم خدا سے طلب کرو۔ دعائے ابوحمزہ ثمالی میں امام سجادؑ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں: ''وَلَیس من صفائک یا سیدی ان تامر باموال وتمنع العطیۃ'' پروردگار تیری یہ صفت نہیں ہے کہ اپنے بندوں کو طلب کرنے کا حکم دے اور ان کے طلب کرنے پر انہیں عطا نہ کرے یعنی خدا کے کرم اور اس کی قدرت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ کہتا ہے کہ مجھ سے طلب کرو تو درحقیقت اس نے ارادہ کرلیا ہے کہ استجابت بھی کرے۔ ''وَاِذا سألکَ عِبادِی عنّی فَاِنّی قَریبٌ اُجیْبُ دَعْوَۃَ الدّاعِ اِذا دَعانِ'' یعنی جب بھی میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو اے پیغمبرؐ آپ کہہ دیجئے کہ میں ان کے قریب ہی ہوں ان کی دعاؤں کو سنتا اور استجاب کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص خدا سے کچھ طلب کرتا ہے تو فوراً اس کو حاصل ہوجاتا ہے: بِکُل مسئلۃ مِنک سمع حاضر و جواب عتید'' یہ خدا کا قطعی اور سچا وعدہ ہے یعنی خدا ہر طلب ودعا کا جواب دیتا ہے لیکن اس وعدے کے ساتھ کچھ شرائط بھی ہیں جن میں سے ایک عمل صالح ہے: ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیہ''۔ قرآن مجید میں خدا نے اپنے بندوں سے جا بجا وعدے فرمائے ہیں۔ مثلاً: ''اِنّا لا نُضِیع اَجر من اَحْسن عملاً'' یعنی جو شخص کار خیر انجام دیتا ہے خدا اس کی جزا اور اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے: ''مَنْ کَانَ یُرید العَاجلَۃَ عَجّلْنَا لَہٗ فِیْھَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ یُرِیْد'' یعنی اگر کوئی انسان دنیا کو اپنا ہدف بنالے تو ہم اس کے ہدف تک رسائی میں اس کی مدد کرتے ہیں لیکن کب؟ جب وہ کوشش کرے، جستجو کرے، اقدام کرے اور آگے بڑھے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: وَمَنْ اَرَادَ الْآخِرۃَ وَسَعیٰ لَھَا سَعْیَھا وَھُوَ مُؤْمِن فَاُولٰئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَشْکُوراً۔۔۔۔۔ھٰؤُلَاءِ وَھٰؤُلَاءِ'' اس آیت میں فرماتا ہے کہ جو لوگ آخرت کی خواہش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں سعی وکوشش کرتے ہیں، ہم ان کی بھی مدد کرتے ہیں۔

ایک آیت میں دنیا کا تذکرہ ہے اور دوسری میں آخرت کا اور دونوں میں شرط یہ ہے کہ سعی وکوشش کی جائے۔ اگر انسان سعی وکوشش کرے تو خداوند عالم یقینا اسے اس کے مقصد تک پہنچاتا ہے۔ یہ سنت الٰہی ہے۔ خدا کسی کی بھی زحمتوں اور کوششوں کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

خداوندعالم ایک دوسری آیت میں یوں وعدہ فرماتا ہے : وَعَدَ اللّٰہُ الَّذینَ اٰمَنُوا مِنْکُم وَعَمِلوا الصالحاتِ لیستَخلِفَنَّهُم فِی الارضِ کَمَا یَستَخلف الّذین مِنْ قَبْلِهِم'' کوئی بھی قوم اگر عمل صالح انجام دے تو خدا اس قوم کو زمین پر خلیفہ بنا دے گا ساری زمین کی قدرت اس قوم کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی ہو ورنہ فقط ایمان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ فقط ایمان سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک دیگر آیت کریمہ میں خداوندعالم وعدہ فرما رہا ہے: ''وَالَّذِینَ جَاهَدُوْا فینا لَنَهدینهم سبلنا'' یعنی اگر کوئی راہ خدا میں قدم اٹھائے تو خدا یقیناً اس کی راہنمائی کرے گا۔

البتہ ضروری نہیں ہے کہ دعا ہمیشہ معجزاتی طور پر قوانین الٰہی کو توڑتی ہوئی مستجاب ہو بلکہ دعا کا خاصہ ہے کہ دعا قوانین طبیعی (Physical laws/laws of Nature) کے دائرے میں قبول ہوتی ہے۔ وعدۂ خدا حق ہے لیکن یہ وعدہ بھی حق ہے کہ اگر انسان اپنے ہدف تک رسائی کے لئے عملی اقدام نہ کرے اور فقط بارگاہ الٰہی میں دعا کرتا رہے تو دعا قبول نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کسی اور وجہ سے مستجاب ہوجائے لیکن استجابت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ قوانین طبیعی کے خلاف دعا کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دعا قوانین طبیعی کی مخالفت کے باوجود بھی قبول ہوجاتی ہے۔ لیکن ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جب دعا دل کی گہرائیوں اور پوری توجہ کے ساتھ کی جائے اور اگر ایسی دعا میں عملی اقدام بھی شامل ہوجائے تو دعا کی استجابت کے امکانات نہایت روشن ہوجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اگر قدرت خدا سے مایوس نہ ہوتے ہوئے مستقل دعا کی جاتی رہے تو بھی قبولیت دعا قوی ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اگر بار بار دعا کرنے پر بھی کوئی حاجت پوری نہ ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہئے مخصوصاً ملک وقوم سے متعلق مسائل میں۔ جس وقت فرعون کی ظالمانہ اور استکباری حکومت میں موسیٰؑ متولد ہوئے تو آپ کی والدہ گرامی نہایت کشمکش و پیچ میں مبتلا تھیں کیوں کہ یہ واضح اور مسلم تھا کہ اس ملک میں پیدا ہونے والا ہر لڑکا قتل کردیا جائے گا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کی جگہ کوئی لڑکی پیدا ہوئی ہوتی تو آپ کی والدہ قطعاً پریشان نہ ہوتیں۔ بہرحال ایک طرف ماں کی محبت اور دوسری طرف فرعون کا حکم۔ اسی درمیان خدا کی جانب سے مادر موسیٰ پر وحی ہوئی: ''وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمّ موسیٰ اَنْ اَرْضِعیه'' یعنی ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی کی کہ موسیٰ کو دودھ پلائیں۔ ''فَاِذَا خِفْتَ عَلَیهِ فَالْقِیهِ فِی الْیَمّ'' پس اگر خطرہ محسوس کرو تو صندوق میں رکھ کر دریا کے حوالے کردو۔ خداوندعالم نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور ہر بار ایک نئی ظرافت (کینواس، وسعت) اور لطافت (باریکی) کے ساتھ بیان کیا ہے۔ الغرض مادر موسیٰ نے خطرے کا احساس کرتے ہی بچے کو دریائے نیل کے حوالے کردیا۔ عجیب وغریب کیفیت ہے کہ ایک ماں اپنے نومولود بچے کو دریا کے حوالے کردے لیکن خدا نے مادر موسیٰ سے اس طرح فرمایا: ''اِنّا رادّوهُ اِلَیکَ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسلین'' اس آیہ کریمہ میں خدا نے مادر موسیٰ سے دو وعدے فرمائے۔ پہلا

یہ کہ اس بچے کو واپس کردیں گے اور دوسرا یہ کہ اس بچے کو مرسلین میں سے قرار دیں گے۔ جب بچے کو دریا میں بہادیا گیا تو خواہرِ موسیٰ سے کہا: ''وقالَت لِاختہ قصیه'' جاؤ دیکھو کیا ہو رہا ہے! جیسے ہی صندوق فرعون کے محل کے نزدیک سے گذرا: ''فالتقطه آل فرعون'' فرعون کے خانوادے نے صندوق باہر نکال لیا۔ اُدھر خدا نے خانوادۂ فرعون کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس بچے کی پرورش کرے۔فرعون کی زوجہ، آسیہ نے کہا کہ کیا اچھا ہوگا اگر ہم اس بچے کی پرورش کرلیں:''قرۃ عینی لی ولک وحرمنا علیه المراضع'' بچے نے دودھ پینے سے انکار کردیا لاکھ کوشش کی گئی مگر جناب موسیٰ نے دودھ نہیں پیا۔ اس درمیان خواہر موسیٰؑ آگے بڑھیں اور کہا: ''هَلْ اَدُلّکم علی اهلِ بیت یکفلونه لکم'' آیا میں ایسے گھرانے کی نشاندہی کروں جو تمہارے لئے اس بچی کی پرورش کرے۔

اگر خداوند عالم ارادہ کرلے تو اس طرح حالات وکوائف کو کسی کے بھی حق میں ڈھال دیتا ہے۔ خواہر موسیٰ کو اس بات پر مامور کردیا کہ وہ اپنے اندر شجاعت پیدا کریں اور فرعون کے محل تک آجائیں اور فرعوں کے سامنے اس طرح کی تجویز رکھیں۔فرعون نے مثبت جواب دے دیا۔خواہر موسیٰؑ گئیں اور مادر موسیٰؑ کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ جیسے ہی موسیٰ نے اپنی ماں کی خوشبو محسوس کی، فوراً دودھ پینا شروع کردیا۔ یہ ہے قدرت خدا! فرعون اور فرعونیوں کے ذہن وگمان میں قطعاً ایسی کوئی بات پیدا نہیں ہوئی کہ یہی موسیٰؑ کی حقیقی ماں ہوسکتی ہیں۔ خدا اس طرح اپنا وعدہ پورا کرتا ہے: ''فَرَدَدْنَاهُ اِلٰی اُمّه'' ہم نے اس بچہ کو اس کی ماں کی طرف پلٹا دیا۔ ''کَیْ تَقر عینها وَلَا تَحْزَنْ'' تا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک انہیں حاصل ہوجائے اور وہ غمزدہ نہ ہوں۔ ''ولتعلم ان وعد اللہ حق'' ساتھ ہی یہ بھی جان لیں کہ خدا کا وعدہ حق رہتا ہے۔ یہ وہ وعدہ ہے جس کو خود مادر موسیٰ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا لیکن دوسرا وعدہ: ''وجَاعِلوا مِنَ المُرسلین'' یہ وہ وعدہ تھا جو مادر موسیٰؑ سے بعثت موسیٰؑ کے متعلق کیا گیا تھا جو برسوں کے بعد محقق ہونے والا تھا۔ اس وعدہ کے تحت جناب موسیٰؑ بطور رسول مبعوث ہونے والے اور بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وجور سے نجات دلانے والے تھے۔ تاریخی مسلمات کی رو سے یہ وعدہ بھی تقریباً چالیس سال کے بعد پورا ہوا اور جناب موسیٰ نے بنی اسرائیل کو راہ نجات کی طرف ہدایت فرمائی۔

خدا نے اپنے وعدے کو اس طرح پائے تکمیل تک پہنچایا ہے۔ خداوند عالم مسلمانوں کو فاتح وظفریاب دیکھنا چاہتا ہے لیکن کب؟ اسی وقت جب مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوں۔ اُٹھیں اور اس سلسلہ میں سعی کو کوشش کریں۔ وعدہ الٰہی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم راہ خدا میں جہاد کرے اور باایمان بھی ہو تو یقیناً فتح یاب ہوگی۔ ''ولمّا رأی المومنونَ الاَحزاب قالوا هذا ما وعدنا الله ورسوله وصدق الله ورسوله'' جس وقت جنگ احزاب میں قریش، سقیف، یہودیوں اور دوسرے مختلف گروہوں نے ایک ساتھ مدینے کا محاصرہ کرلیا اور مسلمانوں

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

حسینیت ہی مرکز انسانیت بن سکتی ہے

حکیم الامت علامہ ہندیؒ سید احمد نقوی

[۳؍شعبان ولادت خامس آل عبا کی مناسبت سے]

عالم میں کوئی مذہب، کوئی ملت، کوئی فلسفہ، کوئی قوم کیا ایسی ہے جو حسینی کارناموں سے منکر ہو؟ ان کی عملی تعلیمات کو برا سمجھتی ہو؟ یا حسینی کارنامے اپنے میں سب سے زائد جاذبیت نہیں رکھتے ہیں؟ سیاسی ہوں یا اقتصادی و معاشرتی وتمدنی وروحانی، جب یہ تسلیم ہے تو کیا ایسی مرکزیت کسی اور چیز کو حاصل ہوسکتی ہے ہرگز نہیں اور وہ کون چیز ہے جو عالم بھر کو اپنی طرف دعوت دے سکے۔ مرکزیت تو وہی شے پیدا کرسکتی ہے جو ہر زمانے، ہر ماحول میں نزاع کی قابلیت نہ رکھتی ہو اور ہر مذہب کے موافق ہو۔ حسینیت ہی وہ شے ہے جو ہر کشمکش ونزاع مٹانے کا پر زور ذریعہ ہے۔ حضرت مسیح فرماتے ہیں: ''جس کے پاس ہے اسی کو دیا جائے گا۔'' یہ ارشاد آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ دین دیندار کو ملے گا، دنیا دنیادار کو ملے گی۔ جو روحانیت کا مالک ہے اس کی روحانی تکمیل کی جائے گی، مادہ پرستوں کو مادیت ہی حاصل ہوگی۔ نفسیات کا یہ اٹل مسئلہ ہے جس کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ حسینیت چونکہ ہر مذہب کی جان ہے اور ہر مذہب میں کم وبیش موجود ہے لہٰذا وہ مرکزیت کی صلاحیت رکھتی ہے اور اسی کو دی جائے گی جس کے پاس حسینیت ہے۔ امام حسینؑ جن فضائل خَلقی وخُلقی کے مالک تھے...... خدا سے ان کو مکمل نبوتی و امامتی فضائل ملے اور شہادت کاملہ کے بعد رسولی کمالات کا اسی طرح سے خاتمہ ہوا جس طرح سے نبوت کا خاتمہ ہوا۔ کیا یزید کو بھی وہی ملا تھا جس کے حسینؑ مالک تھے؟ حسینؑ کو وہ ملا جس کا یزید مالک تھا؟ ہرگز نہیں! مستحق کو ملتا ہے نہ کہ غیر مستحق کو۔ قرآنی آیت تطہیر بتاتی ہے کہ جو افراد پاک وپاکیزہ تھے خدا نے انہیں کی طہارت کی تکمیل کی اور رسول نے ام المومنین ام سلمہ کو ''تم خیر پر ہو'' یہ کہہ کر چادر تطہیر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ آیت ازدواج نبی کے ذکر میں ہے اور وہی موقع بھی تھا۔ گھر والوں میں بیوی بچے سبھی ہوتے ہیں۔ گھر والوں کا ذکر تھا، عورتوں کے واسطے جتنا خالق کو کہنا تھا کہا اور غیر نسواں کے واسطے جو کہنا تھا وہ آیۂ تطہیر میں کہا اور عورتوں کو ضمیروں کے ساتھ خطاب نہیں کیا۔ پر ظاہر ہے کہ طاہر وہی کئے گئے جو پہلے سے طاہر تھے۔ اور یہ طہارت کاملہ تھی۔ یہی حال تقسیم مادیات کا ہے جس میں مستحق وغیر مستحق برابر نہیں ہوتے۔ فطرت نہیں بدلتی ہے۔ تم مادی قوتوں سے عالم بھر کو جھکا سکتے ہو لیکن یہ انفرادی قوت کی کرامت نہ ہوگی۔ وسیع ذرائع ووسائل ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور وہ کامیابی کسی شخص واحد کی نہیں ہوتی ہے۔ حقیقت میں انسان کامل وہ ہے جو محض انسانیت کے بل بوتے پر کھڑا ہو اور تمام مادی قوتوں کو اپنے روحانی زور وبوتے پر اپنے آگے جھکا لے۔ خود بتاؤ امام حسینؑ کے واسطے دنیا میں کوئی

مادی ذریعہ و وسیلہ تھا ؟ ہرگز نہیں ان کا بل بوتا صرف روحانیت تھی جس نے عالم بھر کی مادی ہستیوں کو اپنے سامنے جھکا دیا اور ہر قوم، ہر ملک، ہر مذہب کو اعتراف و اقرار کرنا پڑا کہ وہ انسان کامل تھا اور قابل محبت تھا۔ لہٰذا حسینیت ہی مختلف العقائد انسانوں کی مرکزیت بن سکتی ہے۔ انہیں کو مرکزیت دی جائے گی جن کے پاس مرکزیت پہلے سے ہے۔

ہوشیار لیڈروں کا فرض

قاعدہ ہے کہ زمانے کی کہنگی کے ساتھ بہتر سے بہتر تحریک مردہ ہوجاتی ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں۔ جدت پسند کبھی تو سرے سے اس تحریک کو ختم کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیٰحدہ بناتے ہیں اور کبھی آمیزشوں سے، مراسم کی بھرمار سے اصلی صورت مٹا دیتے ہیں۔ رسول خدا کی وفات کو ابھی کتنا وقفہ ہوا تھا کہ دین اسلام میں خودغرضوں نے طبع زاد امور کی آمیزش سے مسخ کر دیا تھا۔ اس وقت ہوشیار و مصلح وریفارمر علیؑ مرتضیٰ نے اور ان کی اولاد نے مقابلہ نہ کر کے اور تشدد کو جائز نہ سمجھتے ہوئے احتجاج پر اکتفا کی اور انفرادی جدو جہد جاری رکھی۔ یہ ایک پرزور طریقۂ تحفظ اصول و قانون کا تھا جو ہمیشہ صحیح و ثابت ہوگا اور کبھی خطا نہ ہوگی۔ جب قوم حسینیت ترک کرنے پر تل جائے یا حقیقت و صورت بدل دینے پر اتر آئے، دونوں صورتوں میں محاذ جنگ قائم کرنا غلطی ہوگی۔ اس وقت ہوشیار لیڈروں کا یہ کام ہے کہ مقابلہ نہ کر کے ردعمل سے بچیں اور انتہائی احتجاج سے بھی کام نہ چلے تو اس وقت جان توڑ انفرادی جدو جہد شروع کر دیں۔ اس کو خود امام حسینؑ نے بھی بتایا ہے۔ ''جب ٹھنڈا پانی پیو مجھ مظلوم کی پیاس یاد کرو اور جب کسی مظلوم و غریب الوطن کی موت کو سنو تو مجھ مظلوم کی مصیبتوں کو یاد کر لینا'' حسینؑ نے انسانی ضروریات زندگی میں دونوں باتوں کو شامل کر دیا ہے۔ جس وقت زندگی کے ہر لمحہ میں حسینی یاد تازہ ہوتی رہے گی تو کوئی قوت حسینیت کو نہیں مٹا سکتی۔ انفرادی حیثیت موقع پا کر جماعتی رنگ پیدا کرتی رہے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اموی و عباسی دور میں انتہائی جد وجہد و روک ٹوک کے باوجود حسینیت مٹائے نہ مٹ سکی اور ترقی ہی پاتی رہی۔ لہٰذا حسینیت کے بقا کا پرزور ذریعہ یہی ہے کہ ان کی وصیت کو نہ بھولو۔

تبلیغ کی ضرورت

اس مرکزیت کو قائم کرنے کے لئے پرزور تبلیغ کی ضرورت ہے۔ آج دنیا کی قومیں اپنی زندگی صرف پروپیگنڈے سے قائم کئے ہوئے ہیں جس میں کم و بیش جھوٹ شامل ہوتا ہے۔ لیکن اگر صحیح تبلیغ ہو، صحیح اصولوں پر تو کوئی جدو جہد نہیں ہے کہ دور دراز ملکوں میں کچھ نہ کچھ دوست پیدا نہ ہوں۔ اور دلچسپی لینے والے اس خیرخواہانہ مقصد میں بطور سفیر و ایلچی کے کام نہ کریں اور وہ مقصد و تحریک دور دراز ملکوں میں پہنچ کر لوگوں کو اس صحیح مقصد کا ہمدرد نہ بنا دے۔

امام حسینؑ کے مقصد شہادت نے بطور اسلام کے جزو اعظم ہونے کے بلکہ انسانیت کے جزو اعظم ہونے کے ہر متلاشیٔ انسانیت کو اپنی طرف جذب و متوجہ کر لیا ہے۔ اس واسطے کہ اقوام عالم میں کتنی ہی منافرت و بغض و عداوت ہو اور ایک دوسرے کے سائے سے بھاگتا ہو لیکن فطری تقاضا

ہے کہ الم کے موقع پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ خوشی وشادی کے موقعے خدا کی یاد نہیں دلاتے، مصیبت زدہ وغمگین واندوہگین ہی کو خدا یاد آتا ہے۔ حسینؑ کی غمگین تصویر دشمنوں کو بھی شریک غم بنا دے گی۔ ان کی مصیبت جو راہ خدا میں پیش آئی کہاں تک خدا کی یاد کو تازہ نہ کرے گی اور کہاں تک غیر اقوام کو شریک غم نہ بنائے گی۔

یہی فلسفہ حسینی وصیت کا بھی ہے۔ جب ان کی پیاس وغربت وتنہائی کی موت کی یاد تازہ ہوتی رہے گی تو خدا سے بھی غفلت نہ ہوگی۔ اور غیر اقوام سے کشمکش بھی نہ ہوگی اور حسینؑ کی مظلومیت اقوام عالم سے مظلوموں کی ہمدردی کی ہر وقت اپیل کرتی رہے گی اور انسانی فطرت کو ابھارتی رہے گی۔ لہٰذا وقت کی اہم ضرورت ہے کہ حسینیت کی موجودہ ماحول کے مطابق پر زور تبلیغ ہو۔ حسینیت ہی وہ چیز ہے جس نے اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، روحانی مرکزیت کو اپنی اقوام عالم سے منوالیا ہے اور ہر قوم و ہر مذہب میں اپنے ہمدرد پیدا کر لئے ہیں جو حسینؑ کے سفیر و ایلچی کا کام کر رہے ہیں۔ حسینیوں کو اس بین الاقوامی رابطہ کو مضبوط کرنا چاہیے۔ ہم کو کسی مذہب کے خلاف سازش کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ امام حسینؑ نے کسی سے سازش کی، نہ حسینیت میں سازش کی گنجائش ہے۔ ہم کو صرف یہ بتانا ہے کہ حسینیت کیا ہے اور حسینی تہذیب وتمدن کیا ہے؟ اگر ہم کامیاب ہوجائیں تو بے شک حسینیت کو زبردست بین الاقوامی ہمدردی حاصل ہو کہ تمام اقوام سے رشتۂ اتحاد قائم ہوجائے گا۔ اور عالم انسانیت کی بہترین خدمت ہوگی۔ جس کی خود امام حسینؑ نے واقعۂ شہادت سے تعلیم دی ہے اور اپنی مظلومیت کے پیغام کو یہودی و نصاریٰ کے راہبوں (Rabbies)، قسیسوں (Chasidim/Hasidim) تک پہنچایا ہے۔ اس حسینیت کے پیغام کو اگر اقوام قبول کر لیں تو دنیا کی غلط جمہوریتیں، فسطائیت (Fascism)، نازیت (Nazism)، سوشلزم (Socialism)، کمیونزم (Communism)، انارکزم (Anarchism) جو انسانی خون بہانے کے واسطے اپنے اپنے پارٹ کر رہی ہیں سب کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ آج دنیا حسینیت کو چھوڑ چکی ہے اسی لئے تباہ ہو رہی ہے۔

حسینیت کا خلاصہ یہ ہے کہ صحیح قربانی ہو جس سے قومیں وجود میں آتی ہیں۔ ترقی کرتی ہیں، زندگی حاصل کرتی ہیں۔ جان کی قربانی تو آخری منزل ہے۔ ابتدائی منزل اس قربانی کی اخلاقی قربانی ہے۔ اگر آج اس اخلاقی قربانی کو دنیا اختیار کر لے تو بہت کچھ جان کی قربانی سے سبکدوش ہوسکتی ہے۔ یہ قربانی بھی اس زمانے میں مفقود ہے۔ سیاسی مطالبات اور حقوق کی بھرمار نے خلق، مروت، محبت، ہمدردی، رواداری کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں رکھی ہے۔ ایک بھی ڈھونڈے سے نہ ملے گا کہ سوشل زندگی میں کچھ بھی ایثار وقربانی کرے، کوئی کام دنیا کا اب کمپٹیشن سے خالی نہیں ہے۔ اگر اقوام عالم نیک دلی اور سچائی سے کچھ قربانی کریں تو عالم بھر میں بین الاقوامی اتحاد کی لہر دوڑ جائے۔ جس کو قرآن مجید نے بھی بتایا ہے ''تم ہرگز خیر و نیکی نہیں حاصل کر سکتے جب تک اپنی محبوب ترین چیزوں کو دوسروں کو نہ دے دو''

بقیہ صفحہ ۴۳ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مذہبی تصورات کا مبداء کیا ہے؟

رئیس العلماء مولانا سید کاظم نقوی مجتہد (علی گڑھ)

عام طور سے یہ سوال کرنے والے مادہ پرست اور منکرین خدا ہیں۔ انھوں نے مذہب اور خدا کے عقیدے کا سرچشمہ علم الاجتماع (Socialogy) اور علم النفس (Psychology) کے بعض محرکات کو قرار دیا ہے۔

مادہ پرست اس سوال کا جواب جو کچھ دیں لیکن ہمارے نزدیک خدا اور دوسرے ماوراء طبیعی (Metaphysical) امور کی طرف انسان کو خود اس کی فطرت نے متوجہ کیا ہے۔

یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے ہم دریافت کریں کہ انسان کس لئے مل جل کر زندگی بسر کرتا ہے؟ وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کو کیوں پسند نہیں کرتا؟ یا انسان میں جذبہ حب ذات کب سے پیدا ہوا ہے؟ کس زمانے سے اس میں جنسی خواہشیں پیدا ہوئیں اور وہ شریک زندگی کی تلاش میں رہنے لگا؟ کب اس کے دل میں اولاد کی محبت نے جگہ پائی اور وہ اسے اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھنے لگا؟ ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ہے کہ ان امور کا سرچشمہ انسانی فطرت ہے۔ یہ میلانات انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ اسی لئے جب سے انسان ہے وہ ان چیزوں کی طرف مختلف صورتوں سے متوجہ رہا ہے۔

اس کے علاوہ خداوند عالم کی ذات کی طرف متوجہ ہونے کا ایک دوسرا قوی سبب بھی ہے جس کا اثر کسی طرح فطری سبب سے کم نہیں۔ یہ انسان کی عقل وفکر ہے۔ انسان نے یہ دیکھ کر کہ کوئی چیز بغیر علت کے وجود میں نہیں آتی ہے تھوڑے سے غور وخوض کے بعد طے کیا کہ خود اس کے وجود کے لئے، اس کے علاوہ کائنات عالم کے اس حیرت انگیز نظم وضبط کے واسطے جو ہر صاحب فہم کے سامنے ہے، کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہئے۔ اس نے اسی کا نام خدا رکھ لیا۔

دوسرے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ وہی جذبہ کہ جس کی تحریک سے انسان کی زندگی اور نیچر کے مختلف مظاہر کے بارے میں غور کیا۔ وہی جذبہ جس نے اسے آمادہ کیا کہ وہ مادے کے پیچیدہ اسرار، کائنات کے مستقل اور متغیر قانون کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، وہی جذبہ کہ جس نے علم ودانش کے شیدائیوں کو ابھارا کہ وہ عالم طبیعت کے حقائق کا پتہ چلانے کی خاطر زندگی اور اس کی لذتوں سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور اپنی عمر علمی مرکزوں اور صنعتی تجربہ گاہوں میں گزار دیں۔ اس پر اسرار جذبہ انسانی نے انسان سے کہا کہ وجود کے سرچشمہ کا پتہ چلانے کی کوشش کرے۔

جہالت اور نادانی سے مقابلہ، حقائق علم کے جاننے کے لئے کدوکاوش، جو چیزیں انسان کے علم ودانش کی دسترس سے باہر ہیں، انھیں معلوم کرنے کی آرزو انسان کے فطری گہرے احساسات میں سے ہے۔ انسان بہر صورت

فطرت کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے تقریباً اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

قدیم تاریخ کے مطالعے، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تغیرات کی تحقیق، انسانی علم ودانش کے ارتقاء کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی فطرت میں جذبۂ تلاش حق رچا بسا ہوا ہے۔ ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ اکثر وبیشتر علمی کاوشوں کے پس منظر میں ان مادی اور دنیوی فوائد کا حاصل کرنا مقصود تھا جو ان کی وجہ سے افراد یا اقوام کے پہنچنے والے تھے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تمام تحقیقات کا اصلی منبع انسان کا فطری جذبۂ تلاش تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہستی کی واقعیتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے ہاتھوں سے چھوے۔

تاریخ علم وصنعت بتا رہی ہے کہ انسان کا یہ فطری جذبۂ تحقیق جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ اس نے انسان کو ایسی خطرناک آزمائشوں پر آمادہ کر دیا جن میں ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ چاروں طرف سے خطروں میں گھر گیا، لیکن اس کے قدم کبھی رکے نہیں، وہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ اس نے اس راہ میں غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔

اگر چہ بچے عقل وفہم کے لحاظ سے پختہ اور کامل نہیں ہوتے، لیکن انسان کے اس فطری جذبے کے اثرات کو بڑے واضح طور سے ان کی زندگی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

بچہ گویا سوال اور جستجو کا ایک خوبصورت مجسمہ ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ماں باپ اور استاد سے مختلف چیزوں کے متعلق پوچھا کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ مطلب یہ ہے کہ بچہ اس سطحی اور معمولی ادراک پر ہرگز اکتفا نہیں کرتا ہے جو کسی آواز کے سننے یا کسی چیز کے دیکھنے کے بعد اس کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ بچے کے پے در پے اور غیر منظم سوالات بتاتے ہیں کہ اس کی فطرت علم کی پیاسی ہے۔ وہ جہالت اور ناواقفیت کو دور کر کے علم ودانش کے پانی سے سیراب ہونا چاہتا ہے۔

تہذیب کے بالکل ابتدائی زمانے میں بھی انسان ہرگز ہمارے زمانے کے چھ سات برس کے بچے سے عقل وفہم کے لحاظ سے کم نہ تھا۔ کیا وہ ان چیزوں کے بارے میں جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھیں اپنے دل میں پوچھتا نہ ہوگا کہ ان کے اسباب کیا ہیں؟

وہ دیکھتا تھا کہ کسی درخت سے پتے کا گرنا، کسی ٹہنی کا دفعتاً ٹوٹ جانا ہوا کے تیز وتند جھونکے کے چلنے کا نتیجہ ہے۔ اسے نظر آتا تھا کہ جو مکان ابھی ابھی صحیح وسالم اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا موسلا دھار بارش کی وجہ سے مسمار ہو گیا۔ ایسے ہی سیکڑوں واقعات دیکھنے کے بعد وہ ایک علمی اور فلسفیانہ نظریے کا معتقد ہو گیا کہ کوئی حادثہ، کوئی واقعہ اس عالم کائنات میں بے سبب اور بے علت نہیں ہے۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے یقینا یہ ناگزیر ہے کہ اسے اس دنیا کے خالق کی فکر پیدا ہو، جو وجود کا سرچشمہ ہے، جس کی قدرت کے اشارے سے یہ ساری کائنات پیدا ہوئی ہو۔

علوم وفنون کی تاریخ میں اب تک سیکڑوں مفروضات کیے بعد دیگرے دنیا کے سامنے آتے رہے ہیں، لیکن کچھ

عرصہ کے بعد وہ غلط ثابت ہوئے اور ان کی جگہ دوسرے مفروضات نے لے لی۔ یہ مسلّم ہے کہ ان صحیح یا غلط علمی فارمولوں کی طرف انسان کی توجہ کا اصلی سبب اس کا حقیقت طلبی کا جذبہ تھا۔ کوئی عالم اور سائنس داں ان علمی نظریات کی پیدائش کا عقلی اور فکری سبب کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نتیجہ نہیں قرار دیتا ہے۔

اگر ہم سب متفقہ طور سے علمی نظریات کی پیدائش کو اجتماعی اور نفسیاتی مخصوص اسباب کا نتیجہ نہیں سمجھتے تو کیوں اور کس لئے مبداء وجود اور خالق عالم کے تصور کے پیدا ہونے کے بارے میں ایسا سمجھتے ہیں۔

نفسیاتی یا اجتماعی علل واسباب کی احتیاج ان چیزوں کو ہے جن کی کوئی فطری علت اور فکری سبب نہ ہو۔ ایسی صورت میں علم الاجتماع یا علم النفس کو حق حاصل ہے کہ وہ اس خلاء کو بھرنے کے لئے اظہار خیال کرے۔ مثلاً بعض بے ہودہ خیالات کی پیدائش جس کا کوئی فطری یا عقلی سبب موجود نہیں ہے، انھیں ان علوم وفنون کا موضوع فکر بننا چاہئے۔ کچھ لوگ بعض جانوروں کو مبارک اور بعض کو منحوس سمجھتے ہیں۔ بے شک یہ ایسا عقیدہ ہے جس کا سرچشمہ علم النفس اور علم الاجتماع کو معلوم کرنا چاہئے، لیکن ایسے مسائل کو جو انسان کے باطن کا مطالبہ، اس کی خلقت کا تقاضا، اس کی فطرت کی صدا اور اس کے علاوہ عقلی اور فکری محرکات کا نتیجہ ہیں، وہ علم الاجتماع اور علم النفس کے دائرۂ حکومت سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق ان علوم کو اظہار خیال کا ہرگز حق نہیں ہے۔

چونکہ مادہ پرست (Meterialist) طبقہ خدا اور دوسرے مذہبی امور کے بارے میں غور نہیں کرنا چاہتا، وہ اپنے کو ان کی گرفت سے بچانا چاہتا ہے، اس لئے ان کے مقتضائے فطرت ہونے کا انکار کرتے ہوئے ان کے دوسرے اسباب ووجوہ تراشتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں علم الاجتماع اور علم النفس سے مدد لیتا ہے۔ اتفاق سے یہ طبقہ مذہب کی پیدائش کی توجیہ اور تفسیر کے بارے میں اتفاق نہیں رکھتا بلکہ مختلف لوگ اس کے گونا گوں ایک دوسرے (سے) مختلف اسباب وعلل بیان کرتے ہیں۔

کیا مذہب کا سرچشمہ خوف ہے؟

مثلاً نفسیات کے مشہور ماہر ''فرویئڈ'' (Sigmund freud) کے نزدیک مذہب کو نیچر کی بے رحم طاقتوں سے انسان کا خوف وہراس وجود میں لایا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے:

''خلق کائنات کے متعلق ہمارے مذہبی عقیدے کا تعلق ہمارے بچپنے کی زندگی سے ہے۔ بچہ اپنے کو ایک عظیم جہاں کے سامنے عاجز اور بے سہارا محسوس کرتا ہے، تمام ان مبہم خطروں کے مقابلہ کے لئے جو دنیا میں بچہ کو دھمکاتے ہیں، ماں اپنے بچہ کی پہلی حامی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر طرح کے اضطراب کے عالم میں اس کی مددگار رہے۔ بہت جلد باپ ماں کی جگہ آجاتا ہے۔ تمام دور طفولیت میں یہ فریضہ باپ کے ذمہ رہتا ہے۔ بچپنے کا ڈر بالغ ہونے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ بالغ انسان ان تمام خطرات سے آشنا ہوتا ہے جن سے اسے ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ بچہ کے مانند دنیا کے مقابل ضعیف ہے۔ وہ جس طرح بچپن میں باپ کے پہلو میں پناہ لیتا اسی طرح زندگی کی دوسری منزلوں

میں کوئی محافظ اور پشت پناہ چاہتا ہے۔ بنابریں وہی باپ کہ جو بچپن میں اس کے نزدیک بے انتہا طاقت کا مالک تھا بعد میں الوہیت کا تصور بن جاتا ہے جو مافوق بشر ہے۔''

(فرویئڈ اور فرویئڈ ازم ص ۱۴۸)

اس دور کا ایک مورخ مذہبی عقائد کے پیدا ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: -

''خوف دیوتاؤں کو جنم دیتا ہے۔ خوف کہ فہرست میں موت سے ڈر کا درجہ سب سے اہم ہے۔ انسان حیات کے ابتدائی دور میں ہزاروں خطرات کے درمیان تھا اور بہت کم اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی شخص اپنی طبیعی موت سے مرے۔ اکثر بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے دوسروں کے جارحانہ حملوں کے نتیجہ میں یا مہلک بیماریوں کی وجہ سے دنیا سے چلے جاتے تھے۔ اسی بنا پر ابتدائی انسان یہ باور نہیں کرسکتا تھا کہ موت ایک طبیعی حادثہ ہے۔ اسی دلیل سے وہ ہمیشہ اس کے لئے مافوق طبیعیت علت تصور کرتا تھا۔

موت سے خوف، اتفاقی حوادث پر جن کی علت کا انسان پتہ نہیں چلا سکتا، حیرت وتعجب، دیوتاؤں کی امداد کی امید اور ان خوش بختیوں پر جو انسان کو حاصل ہیں شکر گذاری، یہ تمام امور اعتقادات دینی کے اسباب ہیں۔''

(تاریخ ایل ڈورینٹ، ج ا ص ۹۰-۸۹)

یہ سب ایک طرف اور بیسویں صدی کے عظیم المرتبت فلسفی اور رہنما برٹرنڈ رسل دوسری طرف جن کے اسم گرامی سے علمیت اور عظمت جھلکتی ہے، انھوں نے گویا فیصلہ کن بات کہہ دی ہے: -

''میں سوچتا ہوں کہ خدا اور دوسرے مذہبی امور کے عقیدے کی علت خوف ہے۔ چونکہ انسان ایک حد تک اپنے کو ناتواں دیکھتا ہے۔ تین چیزیں ہیں جو اس کے لئے موجبات خوف فراہم کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک نیچر ہے جو صاعقہ کے ذریعہ اس کے سر پر ضرب لگاتی ہے یا زلزلے کے ذریعہ اسے نگل لیتی ہے، دوسری چیز خود انسان ہے جو جنگ کے وسیلے سے اپنے بنی نوع افراد کو تلف کرسکتا ہے، تیسری چیز کا تعلق بہت زیادہ مذہب سے ہے۔ انسان کی شدید جنسی خواہشیں بھی اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ انسان زندگی کے سکون واطمینان کے لحظات میں اپنی بعض حرکتوں پر پشیمان ہوتا ہے۔ مذہب اس کا موجب بنتا ہے کہ انسان کے خوف ووحشت میں کچھ توازن واعتدال پیدا ہو۔''

(توضیح وبررسی مصاحبہ برٹرنڈ رسل۔ وایت ص ۱۲۱)

ان ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حوادث عالم کے مقابلہ میں نہتا، بے چارہ اور کمزور تھا۔ اس لئے وہ ان سے غیر معمولی طور سے خائف تھا۔ اسی خوف نے وجود خدا کا عقیدہ پیدا کیا ہے۔

انسان مہلک بیماریوں کا علاج نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا کہ نیچر کے بے رحم اور سنگدل ہاتھ افراد انسانی کو گروہ در گروہ ہلاک کررہے ہیں۔ وہ ان خوفناک حوادث کے مقابلہ میں نفسیاتی اضطراب کی وجہ سے مجبور تھا کہ کسی مبہم اور پراسرار ہستی کو اپنی پناہ گاہ قرار دے جو اس کے دہلتے ہوئے قلب کو سکون اور اطمینان عطا کرے۔

اس کے علاوہ زمان بلوغ اور اس کے بعد ایک منزل

تک انسان کی زندگی سہارا طلب تھی۔ اس نے ہمیشہ اس زمانے میں اپنے کو ایک طاقتور شخص کی پناہ میں پایا۔ اس نے اسے بہت سے خطرات سے بچایا۔ اس دور کی زندگی نے اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا کیا کہ وہ نیچر کی مہلک طاقتوں کے مقابلہ کے لئے ایک قابل اطمینان پناہ گاہ پیدا کرے۔ ایک وقت گذرنے کے بعد یہی پناہ گاہ خدا کے تصور اور عقیدے کی شکل میں نمودار ہوگئی ہے۔

یہ نظریہ کس حد تک صحیح ہے؟

مذاہب وادیان کی تاریخ مدوّن ہوچکی ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خیال مذہبی طبقہ پر ایک بہت بڑی تہمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس نظریہ کا اظہار کرنے والوں نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے علمی لب ولہجہ میں اسے بیان کیا ہے۔ خدا پرستوں کی طرف یہ تیر علم النفس کے ترکش سے سر کئے گئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کا یہ خیال ایک دعوائے بے دلیل ہے۔ کوئی چھوٹی سی بھی دلیل وہ اس پر قائم نہیں کرسکتے ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا کہ علم النفس اور علم الاجتماع یا ان کے مانند دوسرے علوم کی مدد سے ایسے مسائل کے متعلق اظہار خیال کرنا محل نظر ہے جس کا کوئی داخلی، فطری اور عقلی سبب موجود نہ ہو، اس صورت میں بے شک بجا اور بامحل ہے کہ ان علوم کے ماہرین ان مسائل کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کریں اور ان کا نفسیاتی سبب نیچر کی بے رحم طاقتوں سے ڈر یا زمان طفولیت کے سہارا طلب ہونے کو قرار دیں۔ لیکن ایسے مسائل کی جن کا سبب فطری یا عقلی موجود ہو، پیدائش کی توجیہہ علم النفس یا علم الاجتماع سے کرنا بڑی ناانصافی ہے۔

فرائیڈ اور ان کے ہم خیالوں نے اپنے اس مفروضہ میں صرف یہی نہیں کہ خدا پرستی کے فطری ہونے سے آنکھیں بند کرلی ہیں بلکہ عقلی اور استدلالی خداشناسی سے بھی چشم پوشی فرمائی ہے جس کی بنیاد قانون علت ومعلول کے اوپر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ کچھ مسائل انسان کے اندرونی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پیدا ہونے کے سلسلے میں معقول رویہ یہ ہے کہ انسانی اسباب سے ابتدا کی جائے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا محرک خود انسان کی فطرت اور عقل تو نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ منزل ہے کہ ان کے واسطے اکتسابی، خارجی اور غیر انسانی اسباب قرار دیے جائیں۔

مثلاً بعض اعداد کو عوام الناس منحوس سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس عقیدے کی عقلی بنیاد نظر نہیں آتی۔ انسان کے باطنی میلانات میں اس کا محرک نہیں ملتا۔ تعقل ومنطق کی رو سے ہمیں ان کے اور دوسرے اعداد کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ہم بیرونی اسباب کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی اس خیال اور عقیدے کی پیدائش میں دخیل ہوسکتا ہے۔

اب ہم ان اسباب کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں جو انسان کی فطرت اور قوت، عقل وفہم کے دائرے سے باہر ہیں۔ لیکن مذہبی عقائد ایسے مسائل ہیں جن کے لئے فطری، طبیعی، عقلی، فکری اسباب موجود ہیں۔ وہ ان کی پیدائش کے لئے کافی ہیں۔

خدا پرستی کا مسئلہ انسان کے شادی بیاہ کے مسئلہ کے مانند ہے۔ انسان کی طبیعی خواہش، ذاتی میلان، فطری طلب ازدواج کی طرف عورت اور مرد کو متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد اس گفتگو کا محل نہیں ہے کہ کیوں اور کس لئے انسان کو شادی بیاہ کی فکر ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عقل اور فطرت خدا پرستی کے پیدا ہونے کا عظیم انسانی محرک ہے، بدیہی بات ہے کہ اس طرح کے داخلی اور فطری سبب کے ہوتے ہوئے دوسرے اسباب کی فکر غیر عاقلانہ اور غیر منصفانہ بات ہے۔ اس طرح کی کج روی ویسی ہی ہے کہ کوئی شادی بیاہ کے مسئلہ میں فطری اور طبیعی خواہش کے باوجود یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ انسان جب حسین وجمیل مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ خود اس کے گھر میں اس قسم کے منظر ہوں تا کہ ہر وقت انھیں دیکھ کر لطف اندوز ہو جس طرح پہاڑوں، بیابانوں میں انھیں دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ عورت بھی حسین وجمیل اور خوش منظر ہے۔ انسان نے چاہا کہ وہ بھی مجھ سے نزدیک رہے۔ اسی جذبہ نے اسے شادی بیاہ کے لئے آمادہ کیا۔

مسئلہ ازدواج میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے کھیتی باڑی کے سامان کی شکل کو جب دیکھا تو اسے شادی کرنے کی فکر ہوئی۔ کیا مسئلہ ازدواج کا جب داخلی، انسانی، فطری محرک موجود ہے تو اس قسم کے دور از کار توجیہات نامعقول اور مضحکہ خیز نہیں ہے؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ خدا پرستوں کے طبقہ میں کس کس طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اگر یہ طبقہ صرف نادان، بے سود اور جاہل لوگوں پر مشتمل ہوتا، تو کسی حد تک معقول تھا کہ یہ کہا جائے کہ مذہب اور وجود خدا کا عقیدہ نیچر کی بے رحم طاقتوں سے ڈر کا پیدا کیا ہوا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس گروہ کے پیش رو علماء اور عقلاء میں وہ کہ جو صرف یہی نہیں کہ طبیعی طاقتوں کو جانتے ہیں بلکہ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان پر کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے، ان کو کس طرح نقصان کے بجائے فائدہ رسانی کے کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔

آیا واقعی کہا جاسکتا ہے کہ سقراط، افلاطون، ارسطو، ابن سینا، رازی، طوسی، ابن ہیثم، ہزاروں مشرقی اور مغربی خدا پرست اہل علم کا ایمان جو سب کے سب علوم وفنون کے بانی اور علمی اسرار ورموز کا انکشاف کرنے والے تھے عالم مادہ کے غیظ وغضب سے ہراس کا نتیجہ تھا؟

خدا پرستی کی تاریخ بتاتی ہے کہ خدا کو ماننے والے طبقہ نے ہمیشہ اپنے عقیدہ کی وجہ قوی اصول اور معقول دلائل کی روشنی میں بیان کی ہے۔

خدا پرست علماء کی طرف سے ہزاروں کتابیں خداوند عالم کے وجود اور دوسرے مذہبی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں، لیکن عام طور سے وہی علمی اور استدلالی طریقۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ کہیں بھی یہ بحث نظر نہیں آتی کہ نیچر کے قویٰ چونکہ سنگ دل اور بے رحم ہیں لہٰذا ان سے چھٹکارے کے لئے ایک عظیم الشان پناہ گاہ کی انسان کو ضرورت محسوس ہوئی، اسی کا نام خدا ہے۔

افلاطون نے حدوث عالم کو خالق کے وجود کی دلیل

قرار دیا ہے۔ ارسطو نے حرکت عمومی کے وجود کو وجود محرک کی نشانی جانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر طرح کی حرکت محرک کی محتاج ہے، عالم مادہ میں ہر چیز متحرک نظر آتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی ذات سے علاحدہ کوئی محرک ہو۔

یورپ کی علمی تحریک کے بعد علوم طبیعی کی ماہرین میں سے کچھ لوگوں نے مخصوص طرح کی دلیلیں قائم کر کے خداوند عالم کے وجود کو ثابت کرنا شروع کیا۔ مثلاً نیوٹن کہتا ہے کہ ایک دنیا کا کوئی مادہ ہرگز اس پر قادر نہیں ہے کہ رنگ برنگ کے موجودات پیدا کرے۔ یہ اختلاف وتنوع جو خلقت میں ہمارے سامنے ہے بتا رہا ہے کہ اس مادی سازوسامان کے پیچھے کسی قدرت کا ہاتھ ہے جس نے اس مادے میں تصرف کیا ہے۔

مصنوعی دماغ کا جب اس کی مشینری تیار کر چکا تو کہنے لگا کہ ایک مصنوعی دماغ جب بغیر انسانی عقل وتدبیر کے وجود میں آنے کے قابل نہیں ہے، تو سچ مچ کا اصلی دماغ جو اس مصنوعی دماغ سے لاکھوں گنا زیادہ پیچیدہ اور پراسرار ہے قطعاً کسی بنانے والے کا محتاج ہے۔

آیا ان واضح دلائل کے بعد جو علوم وفنون کے بانیوں نے پیش کئے ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوع انسانی کے درمیان خدا کے اعتقاد نیچر کی بے رحم طاقتوں سے خوف وہراس کا نتیجہ ہے؟

آج بھی خدا پرست اہل علم جو خدا کے وجود پر ایمان راسخ رکھتے ہیں کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضبوط، مستحکم عقلی دلیلوں کی روشنی میں خدا کے معتقد ہیں۔ انھیں نیچر کی ظالم طاقتوں سے خوف وہراس نے خدا کے وجود کا قائل نہیں بنایا ہے۔ (جاری)

بقیہ مناجات واستغفار-------------------------------

پر حملہ کر دیا تھا اس وقت خود مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ مومنین پر مشتمل تھا اور دوسرا غیر مومنین پر۔ غیر مومنین کہہ رہے تھے: ''مَاوعدنا الله ورسوله الا غروراً'' یعنی ہم فریب کھا گئے ہیں۔ اسلام ہمارے امن وامان اور عزت کی حفاظت نہیں کر سکا۔ دوسری طرف مومنین کا گروہ تھا جو یہ کہہ رہا تھا: ''هذاماوعدنا الله ورسوله'' یعنی یہ وہی وعدہ ہے جو خود خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے کیا تھا۔ وعدۂ خدا اور رسول اس طرح واقع ہوتا ہے: ''انّ الّذين آمنوا يقاتلون فى سبيل الله والذين كفروا يقاتلون فى سبيل الطاغوت'' وہ لوگ جو مومن ہوتے ہیں راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے راہ طاغوت میں جہاد کرتے ہیں۔ اگر مسلمان میدان جنگ میں ڈٹا رہے اور خدا کی قدرت سے مایوس نہ ہو تو یقیناً فتح اسی کی ہوگی لیکن اگر مایوس اور پسپا ہو گیا تو وعدۂ خدا بھی بہرحال پورا نہیں ہوگا۔ پس اگر دشمن حملہ کردے تو تعجب کا مقام نہیں ہے بلکہ یہ تو وعدۂ الٰہی ہے جو پورا ہو رہا ہے: ''هذاماوعدنا الله ورسوله وصدق الله ورسوله ما زادهم الا ايماناً وتسليماً''۔

★★★

امام زمانؑ اور مہدویت کا نظریہ

عماد العلماء علامہ سید علی محمد نقوی صاحب

۲۶۰ھ مطابق ۸۰۳ء امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد مشیت خداوندی نے بارہویں امام حضرت مہدیؑ کو پردۂ غیبت میں روپوش کردیا تاکہ مشعل بردار نور، ظلمت کی طاقتوں کی یورش سے محفوظ رہے۔

غیبت امام کے زمانہ کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دورِ غیبت صغریٰ جس کی وسعت ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء سے ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۰ء تک ہے اور دور غیبت کبریٰ جو ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ غیبت صغریٰ کے دوران امام اپنے نائبوں کے ذریعہ (نائبین اربعہ) اپنے پیروؤں سے رابطہ رکھتے تھے مگر اس کے بعد سے یہ ظاہری رابطہ منقطع ہوگیا اور امام مکمل طور پر پردۂ غیبت میں چلے گئے ایک مناسب مدت تک کے لئے جسے مشیت خداوندی منتخب کرے گی اس وقت وہ ظہور فرمائیں گے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام مہدیؑ کے ظہور کے ساتھ ہی دنیا میں حکومت عدل ونظام الٰہی قائم ہوجائے گا اور اسلام کی حقیقی تعلیمات مکمل رائج ہوجائیں گی۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی کی اتنی طویل عمر ہو؟ جواب یہ ہے کہ ائمہ ایسے انسان ہیں جو خداوند عالم کے خصوصی فیض وعنایت کے حامل ہیں۔ درآں حالیکہ وہ انسان ہیں خصوصی قوت واختیارات کے مالک بھی ہیں اور روحانی بلندی کے لحاظ سے معنوی رتبہ کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہیں، اگر ان مقدس ہستیوں میں سے کوئی عام انسانوں کے برخلاف زمان ومکان کی قید سے خدائے بزرگ کی خاص عنایت کہ وجہ سے آزاد ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ہم خداوند تعالیٰ کی ذات، اس کی قدرت اور روحانیت پر اعتقاد رکھیں تو ہمارے لئے اس حقیقت کا درک چنداں مشکل نہیں کہ ائمہ میں سے کوئی صدیوں تک موت سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ خداوند قدوس جو موت وزیست کے قانون کا بانی ہے بلاشک کسی کی حیات کو معمول سے زیادہ اپنی مشیت کے مطابق طویل کردینے پر بھی قادر ہے۔ کسی مسلمان کے لئے بالخصوص اس امر میں کسی شک یا تردید کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ قرآن کی رو سے ہر مسلمان کا یہ اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت خضرؑ آج بھی زندہ ہیں اور حضرت نوحؑ نے سینکڑوں سال کی عمر پائی۔

دوران غیبت میں امام کون سا کردار ادا کررہے ہیں؟

ممکن ہے سوال پیدا ہو کہ امام دور غیبت میں کون سا کردار ادا کررہے ہیں یا کیا ان کی امامت بے کار اور لاحاصل ہے؟ یہ شبہ امامت کی حقیقت اور فرائض اسلام سے ناواقفیت کی پیداوار ہے جیسا کہ بار بار بتایا گیا ہے کہ امام

صرف سیاسی، اجتماعی اور فکری رہبری کے فرائض انجام نہیں دیتا بلکہ اہم معنوی، باطنی اور روحانی فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ امام دنیا والوں کے لئے فیضان الٰہی کا ایک وسیلہ ہے جو لوگ انسانی اور معنوی ارتقاء کی راہوں پر گام فرسا ہوتے ہیں امام ان روحوں کی رہبری کرتا ہے۔ امام کے فرائض محض اجتماعی اور مادی ہی نہیں ہیں بلکہ باطنی اور روحانی بھی ہیں۔ امام صرف جسم ہی سے نہیں بلکہ روح سے بھی رابطہ رکھتا ہے اور مومنوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ امام کے اس ماورائی اور باطنی پہلو کو اگر مدنظر رکھا جائے تو اس کے ذریعہ ہم غیبت کے زمانے میں امام کے کردار کو سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں بھی باطنی رہبری اور ہدایت کی طرف اشارہ موجود ہے اور الیاسؑ وخضرؑ جیسے انبیاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو باطنی طور پر لوگوں کو نیکی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ امام آفاق باطن میں بھی موجود ہوتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے کہ امام دنیا والوں کے لئے عنایت وفیضان ربانی کا وسیلہ ہے۔ خدا نے انسان کو اپنے فن تخلیق کے شاہکار کی حیثیت سے پیدا کیا ہے جس میں بعض ملکوتی صفات بھی موجود ہیں۔ ''**خلق الله آدم علی صورته**'' لیکن صرف ان انسانوں میں جو پیغمبر اور ائمہ ہیں اپنی عظمت تخلیق کے ہر رخ، ہر پہلو اور ہر خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح ائمہ خالق کی خلاقیت کی عظمت کا مجسمہ ہوتے ہیں، جس طرح ایک مصور تمام نقش اپنا شاہکار بنانے کے لئے کھینچتا ہے اسی طرح خالق کائنات نے بھی زمین وآسمان ان ہی مقدس ہستیوں کے لئے خلق کئے ہیں جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ: ''**لولاک لما خلقت الافلاک**'' یعنی ''اے محمدؐ اگر تم نہ ہوتے تو میں یہ زمین وآسمان پیدا نہ کرتا۔'' ایسی صورت میں تمام ائمہ بھی اسی ''حقیقت محمدی'' سے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: ''**اولنا محمد واوسطنا محمد وآخرنا محمد۔**'' اس رو سے سارے ائمہ حدیث قدسی کے اس جملہ کے مصداق ہیں۔

اس لئے ہر دور اور ہر زمانہ میں ہستی کی بقا کا سبب اور فیض خداوندی کے انسانوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔

امام پردۂ غیبت میں وہ خورشید ہیں کہ جس کے گرد زمین، چاند اور ستارے گردش کر رہے ہیں، دانستہ یا نادانستہ تمام موجودات امام کی ذات سے نور ہدایت کا اکتساب کرتے ہیں، اسی وجہ سے امام رضاؑ کی مشہور حدیث میں آیا ہے کہ: ''**الامام کالشمس الطالعة المجللة بنورها العالم وهو بالافق حیث لاینالہ الابصار ولاالایدی۔**'' یعنی ''امام مثل خورشید کے درخشاں ہے کہ تمام جہاں کو منور کرتا ہے اور وہ ان آفاق پر جلوہ گر ہے جہاں نہ نظر اسے پا سکتی ہے نہ حواس خمسہ اسے چھو سکتے ہیں۔

فلسفۂ غیبت

مہدویت کے نظریۂ کی بنیاد کیا ہے؟ اس نظریہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم فلسفۂ تاریخ اور ہستی کے متعلق اسلامی نکتۂ نظر سے آشنا ہوں۔ تاریخ کی ترقی پذیری اور دنیا میں انسانی زندگی کی آزمائشی کیفیت اور انسان کے انتخاب اور آزاد ارادہ کے مالک ہونے کے اسلامی نکتۂ نظر کی روشنی میں

ہم انبیاء کی بعثت کی ضرورت، ختم نبوت کا راز اور بارہ اماموں کے تعین کے اسباب اور حضرت مہدیؑ کی غیبت اور دوبارہ ظہور کے فلسفہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی نکتہ نظر سے خدا نے انسان کو ایسے موجود کے طور پر بنایا ہے جو اشرف المخلوقات اور ''ارادہ''، ''تعقل''، ''ایمان'' اور ''اشراق'' یعنی الہام کا مالک ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ''ارادہ'' کی آزادی اور انتخاب کی توانائی سے نوازا ہے۔ جو ایک طرف تو خدا کی عظیم عنایت ہیں مگر دوسری طرف ایسی بڑی ذمہ داری دی جسے قبول کرنے سے پہاڑوں، زمین اور آسمان نے انکار کر دیا تھا۔ اگر ارادہ کی آزادی اور انتخاب کی توانائی نہ ہو تو انسان جانور اور چوپایوں سے بھی نیچے گر جائے۔

مگر انتخاب اس وقت کارآمد ہوتا ہے جب راہ راست واضح ہوتی ہے۔ خداوند عالم نے جس کی عنایت اس کے وجود کا لازمہ ہے ''نبوت'' کا سلسلہ اسی مقصد کے حصول کے لئے نیز انسان کی سعادت اور نجات کے ذرائع فراہم کرنے کے لئے ہی قائم کیا۔ انسان کی روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگرے پیغمبران مبعوث ہوئے اور مختلف حقائق کے چہرے بے نقاب کئے یہاں تک کہ حضرت محمدؐ کی بعثت اور نزول قرآن کے ساتھ ہی ''حقیقت'' اور ''پیغام'' مکمل طور پر بندوں تک پہنچ گئے، دین کی تکمیل ہوگئی، اس کے ارکان اور اصلی خطوط متعین ہو گئے۔ چونکہ ''پیغام'' پہنچانے کا کام مکمل ہو چکا تھا لہٰذا حضرت محمدؐ کے ساتھ ہی بعثت انبیاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور حضرت خاتم الانبیاء کی رسالت ہر زمانے کے لئے لازمی طور پر قابل اتباع ہوگئی اور اس کے بعد سے قیامت تک تمام انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی پیروی کریں۔

اس کے بعد شرح وتفسیر اور اجرا و نفاذ کا مرحلہ سامنے آتا ہے قرآن میں ''پیام'' یکجا پہنچ گیا مگر عام انسانوں کے لئے کلام الٰہی کے رموز کا عرفان ممکن نہ تھا لہٰذا ضرورت تھی ایسے خدائی افراد کی جو ایک طرف تو حدیثوں کے ذریعہ پیام قرآنی کے تمام گوشوں اور باریکیوں کی تفسیر وتشریح اور سیرت پیغمبر کی تفصیل پیش کریں دوسری طرف عملی طور پر درس دیں کہ مختلف حالات میں انسان کس طرح کی حکمت عملی اختیار کرے۔ اس کے علاوہ قرآن کے ساتھ ساتھ ضرورت تھی کہ کچھ ایسے افراد ہوں جو انسانوں کے لئے ''اسوۂ جاوید'' اور عملی نمونہ ہوں، اس وجہ سے خدا نے ''امامت'' کا سلسلہ قائم کیا۔

لیکن انسانوں کی تربیت (نبوت عامہ) اور خدائی ''پیام'' پورے طور پر پہنچ جانے کے بعد (نبوت خاصہ) جب معلمان الٰہی اور رہبروں نے اس کی تشریح کر دی (منصب امامت) تو مشیت خداوندی کا رُخ اس طرف ہوا کہ ایک امام کو پردۂ غیبت میں روپوش کر دے تا کہ پیغمبروں اور سابقہ اماموں کی تعلیمات کی روشنی میں اور اپنی عقل کی مدد اور فکری توانائی کے ذریعہ اپنے اجتہاد کو صحیح طور پر پورا کریں۔ غیبت کے بعد کا دور ''اجتہاد'' کا دور ہے۔ انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے علم اور اپنی عقل کا صحیح استعمال کریں تا کہ وحی اور سیرت پیغمبر وائمہ کی شمع ہدایت اور مشعل رہبری سے اپنے مسائل کے حل کے سلسلہ میں فائدہ حاصل کریں۔ بالآخر مشیت الٰہی دوبارہ امام کو پردۂ غیبت سے ظاہر کرے

گی تا کہ دنیا میں نظریاتی معاشرہ اور مثالی نظام قائم ہو۔ انسان دور غیبت میں ایک امتحانی اور آزمائشی مرحلہ سے دوچار ہے، اس کے بعد خدائی معلم دوبارہ ظاہر ہوگا اور صحیح کو غلط سے اور حق کو باطل سے الگ کردے گا۔

ہم اس ہدایت کے پورے خدائی انتظام کو ایک اسکول سے تشبیہ دے سکتے ہیں، گویا پہلے مختلف درجوں کی تعلیم مکمل کرائی گئی (بعثت انبیاء) اور تحریری رہنمائی بھیجی گئی (وحی) آخری درجہ کی نظریاتی تکمیل شریعت کی تکمیل کی صورت میں کی گئی (پیغمبرؐ اسلام کی بعثت) پھر گیارہ اماموں نے اس تعلیم کو عملی طور پر برت کر دکھایا۔ (امامت کا دور) اس کے بعد معلم کو غیبت کے پردے میں چھپا لیا گیا اور طالب علموں کو چھوڑ دیا گیا کہ عقل وخرد اور استعداد کے بل بوتے پر امتحان دیں (غیبت کا زمانہ) اس کے بعد معلم دوبارہ ظاہر ہوں گے اور صحیح جواب کی عملی طور پر نشان دہی فرمائیں گے (ظہور) اس تشبیہ کے ذریعہ ہم غیبت کے فلسفہ کو تھوڑا سا سمجھ سکتے ہیں۔

☆☆☆

بقیہ حسینیت ہی مرکز انسانیت بن سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ ابتدائی اور اخلاقی ایثار وقربانی ہے۔ دنیا بھر کی قوتیں جمع ہوں، عالم بھر کے مدبر ومفکر جمع ہوں، اس قرآنی فلسفہ کے خلاف ہرگز بہبودی وامن کی زندگی حاصل نہیں کرسکتے۔ امن واتحاد کی غرض سے کچھ نہ کچھ صلح وآشتی اسی وقت ہوتی ہے جب ایک نے کچھ دوسرے کو دیا ہے۔ سلطنتی معاہدات کو دیکھ لو، اپنے نجی کشمکشوں میں روزانہ کی دیکھ، نزاعیں جھگڑے تو اسی وقت مٹے جب غم خوری کی اور فریق ثانی کو بھی دیا ہے۔ اور جن قوموں کو اپنی محبوب ترین چیزوں کے غیروں کو دے دینے کی عادت ہوگئی ان کا کیا پوچھنا! ان سے کسی جھگڑے اور نزاع کا ہونا، ظلم کے سوا اور بے قصوروں کو ستانے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ تاریخ عالم ایسے کمینہ پن پر کبھی تائید نہ کرے گی اور انفاق وخیرات کردینے والے کے واسطے تاریخ عالم کی پہلی صف قرار پائے گی۔ یہی تو امام حسینؑ کی خاندانی خصوصیت ہے جو صغرسنی سے ایثار وقربانی کے پتلا تھے۔ کم سنی میں روزے پر روزہ تین روز رکھنا، اس صورت میں کہ ابھی بیماری سے اٹھے ہیں اور سامنے کھانا برابر تین روز تک یتیم واسیر ومسکین کو اٹھا دینا اور پانی پی کر سو رہنا، یہ حسینؑ ہی کا کام تھا۔ بخشش وعطا اس گھرانے سے زائد کسی کو تاریخوں کو دیکھ لو۔ ہر انسان کے واسطے اس کا وطن، جان ومال، اولاد، عزت، محبوب ترین چیزیں ہیں۔ امام حسینؑ نے مذکورہ ہر شے کو حفاظت دین واخلاق وانسانیت کے لئے جس بے باکی سے دے دیا وہ تاریخ کا یادگار واقعہ ہے اور عالم کو قربانی کا صحیح سبق تعلیم کرایا۔ اب بھی اقوام عالم انسانیت سے کام لیں اور ایک دوسرے کے واسطے کچھ ایثار وقربانی کریں تو دنیا کو خوشحالی وامن نصیب ہوسکتا ہے اور یہ جبھی ہوسکتا ہے جب کہ حسینیت کو مرکز اتحاد بنایا جائے۔!!

☆☆☆

حضرت عباسؑ کی شخصیت

محترمہ سیدہ عندلیب زہرا کامونپوری صاحبہ، لکھنؤ

سیرت رسولؐ نے جونقوش چھوڑے اور اہلبیت اطہارؑ نے جیسا ماحول پیش کیا وہ تاریخ سے پوشیدہ نہیں، اہلبیتؑ کی سیرت نے تمام شعبۂ زندگی کو درخشاں کردیا۔ صالح ذہن کو نشوونما کے لئے اس سے بڑی مدد ملتی اور نیک دل انسان اس سے پوری طرح فیض یاب ہوگئے۔ صرف وہ لوگ جن کے ذہن پر باطل مسلط تھا اور جن لوگوں نے اپنے دلوں پر کفر کی مہر لگا رکھی تھی وہ اس زمانے اور ماحول میں بھی غلط راستے پر چلتے رہے، اور ماحول کے اثر سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ لیکن جن لوگوں نے اسی خاندان میں آنکھ کھولی اور ماحول سے مانوس رہے ان کی سیرت وکردار میں وہی جھلک نظر آئی۔ اس قیادت کے نقوش اتنے گہرے ہوچکے تھے کہ وہ کبھی دھندلے نہ ہوئے، بلکہ اس میں استحکام پیدا ہوگیا۔

حضرت عباسؑ نے ۲۶ھ میں امیرالمومنین حضرت علیؑ کی گود میں آنکھ کھولی۔ امام ومعصوم باپ کے زیر تربیت بچپن کی منزلیں طے کیں۔ سبطین رسول حضرات حسنین علیہما السلام کے ساتھ پلے اور بڑھے۔ چنانچہ کمسنی ہی میں آپ اعلیٰ معرفت کی منزل تک پہنچ گئے۔

آپؑ کی والدۂ محترمہ جناب ام البنین تھیں، جس طرح ازواج رسولؐ میں جناب خدیجہ کے بعد حضرت ام سلمہ کا نمایاں مقام تھا اسی طرح حضرت خاتون جنتؑ کے بعد ازواج امیرالمومنینؑ میں حضرت ام البنین کی بہت اہمیت ہے، تاریخ میں مذکور ہے کہ حضرت علیؑ نے جناب سیدہؑ کی وفات کے بعد اپنے بھائی حضرت عقیل سے فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لئے ایسے خاندان کی عورت تجویز کریں جو نہایت بہادر اور جری ہوتا کہ اس عورت سے جو بچہ پیدا ہو وہ بھی نہایت ہی بہادر ہو۔''

چنانچہ جناب عقیل نے فرمایا کہ آپ فاطمہ کلابیہ سے شادی کریں کیونکہ وہ بہادر خاندان کی خاتون ہیں اور حضرت علیؑ نے آپ سے عقد فرمایا۔ آپ کا نام فاطمہ تھا، آپ حزام بن خالد بن ربیعہ بن لومی بن غالب بن کعب بن عامر بن صعصعہ بن معاویہ ابی بکر بن ہوزان کی بیٹی تھیں۔ حضرت عباسؑ ان ہی کے بیٹے تھے۔

علامہ شیخ طاہر سماوی اپنی کتاب ابصار العین میں لکھتے ہیں کہ حضرت عباسؑ صفین کی جنگ میں موجود تھے لیکن دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضرت علیؑ نے جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس واقعہ سے یقینی طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ حضرت عباسؑ کی فوجی تربیت اسی عہد سے جاری تھی۔ اور غالباً اذن جنگ اس لئے نہیں ملا تھا کہ آپ معرکہ کربلا کی امانت تھے۔

حضرت عباسؑ کا نام ومقام نصرت وحمایت امام میں چند خصوصیات کی وجہ سے سب میں نمایاں ہے۔ آپ اپنے

حسن و جمال کی وجہ سے ''قمر بنی ہاشم'' کہے جاتے تھے۔ ہمت وشجاعت کی وجہ سے آپ علمدار حسینی تھے، پابندی حکم امام حسین کو فرض کا درجہ دیتے تھے، امام حسینؑ نے حضرت عباس کو ''افضل الشہدا'' کے ممتاز لقب سے نوازا ہے، امام نے آپ کی شہادت پر یہ شعر پڑھا تھا:

یاافضل الشھدا یابن المرتضیٰ

صلّی علیک اللہ کل اوان

آپ کا لقب ''سقائے حرم'' ہے، کیونکہ آپ نے کربلا میں بچوں کے لئے پانی کے حصول میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ آپ کی کنیت ابوالفضل تھی اور شہادت کے بعد آپ کا لقب ابوقربہ پڑ گیا تھا۔ کیونکہ پیاسوں کی پیاس بجھانے کے لئے آپ نے پوری کوشش کی۔ آپ نے حصول آب کے سلسلہ میں کنویں کھودے، فرات تک پہنچ گئے اہل حرم تک پانی پہنچانے کے سلسلہ میں آپ کے دونوں ہاتھ کاٹے گئے تھے۔

ساتویں محرم ۶۱ھ کے بعد ابن زیاد کا خط عمر بن سعد کے نام آیا کہ حسینؑ اور اطفال حسین پر پانی بند کردو۔

عمر بن سعد نے عمر بن حجاج کو پانچ سو سواروں کے دستہ کے ساتھ نہر فرات پر بٹھا دیا اور امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر مکمل بندش کردی گئی۔ اس موقع پر دشمن نہایت بے شرمی و بے حیائی سے کہتے تھے۔

''اے حسینؑ اس پانی کو کتّے اور عراق کے جنگلی سور اور گدھے، بھیڑیے پیتے ہیں اور دل ٹھنڈا کرتے ہیں مگر خدا کی قسم تم کو پانی کا مزہ چکھنے کے لئے بھی ایک قطرہ نہ ملے گا، یہاں تک کہ (معاذ اللہ) جہنم کے گرم پانی سے سیراب ہو۔''

امام حسینؑ کو بندش آب سے زیادہ دشمن کی سخت کلامی کا صدمہ تھا۔ جب امام حسینؑ سے بچوں کی پیاس نہ دیکھی گئی تو روایات میں ملتا ہے کہ حضرت عباسؑ کو بلا کر فرمایا کہ ان کے لئے پانی کا انتظام کرو اور کنواں کھودو۔ کنواں کھودا گیا لیکن پانی نہیں نکلا اور پھر اسے بند کردیا۔ پیاس کی شدت آفتاب کی تیزی زمین کی گرمی ایسے سخت اور نازک وقت میں عراق جیسی خشک زمین پر کنواں کھودنا حضرت عباسؑ ہی کا کام تھا۔

ابن زیاد نے شمر کے مشورے سے عمر بن سعد کو خط لکھا کہ بغیر تاخیر حسینؑ پر حملہ کردو۔ جب ابن زیاد خط روانہ کرنے لگا تو حاضرین دربار میں سے ایک شخص جریر بن عبداللہ اٹھا اور ابن زیاد سے کہنے لگا:

''اے امیر جب علیؑ اپنی خلافت کے زمانہ میں کوفہ میں مقیم تھے تو میری چچازاد بہن ام البنین سے نکاح کیا تھا، ان سے چار لڑکے ہوئے تھے، عبداللہ، جعفر، عباس اور عثمان۔ یہ سب میرے بھانجے ہیں آپ انھیں ایک امان نامہ لکھ دیں۔''

ابن زیاد نے کہا میں نے ان کو امان دی، جریر نے ایک خط میں امان کا ذکر کیا اور اپنے غلام عرفان کو بلا کر کہا کہ فوراً کربلا جاکر اس خط کو عباسؑ کو دے دو۔ خط میں تحریر تھا:

''اے عباس زمانہ بہت ناسازگار ہے اور حفاظت جان و مال ہر انسان پر واجب ہے تم فوراً حسین کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہوجاؤ۔'' حضرت عباسؑ نے اس خط کو پڑھ کر فوراً پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور عرفان سے کہا جاکر کہہ دو کہ ہمارے لئے خدا کی امان کافی ہے۔ عرفان شمر کے سامنے یہ واقعہ دہراتا ہوا کوفہ واپس چلا گیا اور جریر کو اطلاع کی۔

نویں محرم کی صبح کو شمر بد نہاد ابن زیاد کا وہ خط لے کر کربلا میں وارد ہوا جس میں امام حسینؑ کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ: ''اگر حسینؑ بیعت کرلیں تو ان کو زندہ ہمارے پاس لاؤ ورنہ ان پر حملہ کرو اور تلواروں سے گردن کاٹ کر لاشوں پر گھوڑے دوڑا دو۔''

شمر حضرت عباس کی والدہ کے قبیلہ کا فرد تھا اپنے زعم ناقص میں امام حسین کو کمزور کرنے کے لئے اس نے بھی ابن زیاد سے حضرت عباس اور ان کے بھائیوں کے لئے امان نامہ لے لیا تھا۔

عرب میں قبیلے کے مرد اپنے قبیلہ کی لڑکی کی اولاد کو بھانجے اور بھانجی کہا کرتے تھے، شمر بھی لشکر سے نکل کر امام کے قریب آیا اور آواز دی:

''ہمارے بھانجے عبداللہ وجعفر وعباس وعثمان کہاں ہیں مجھے ان سے کچھ باتیں کہنی ہیں۔''

امام نے فوراً حضرت عباس سے کہا کہ اگر چہ یہ باطل پرست اور فاسق ہے لیکن چونکہ تمہارا رشتہ کا ماموں ہے لہٰذا تم اس کا جواب دو۔

حضرت عباس مع بھائیوں کے شمر کی طرف بڑھے اور تند لہجہ میں فرمایا:

''ہمیں کس لئے بلایا ہے؟''

اس نے کہا: ''تم ہماری بہن کے لڑکے ہو، تم لوگوں کے لئے ہر طرح کی حفاظت اور امان ہے، تم ہمارے ساتھ ہولو۔ حسین کے ساتھ اپنی زندگی برباد نہ کرو۔''

حضرت عباس نے انتہائی غیظ وغضب میں فرمایا:

''خدا تیرے ہاتھ توڑ ڈالے ملعون تیری امان پر لعنت ہے۔ اے دشمن خدا ہم اپنے بھائی وسردار حسین بن فاطمہ کو چھوڑیں اور ایک ملعون زادے کی بیعت کریں۔''

جب شمر نے یہ جواب سن لیا اور اسے حضرت عباس کی طرف سے مایوسی ہوئی تو وہ لشکر عمر بن سعد میں پہنچا اور اس سے پرزور خواہش کی کہ اسی وقت خیمہ حسین پر حملہ کردیا جائے۔ ابن سعد نے فوج کو ایسا ہی حکم دیا۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر حضرت زینبؑ نے امام سے کہا بھائی دشمن کا لشکر آ گیا۔ اور پھر حضرت عباس نے بھی لشکر کے حملے کی امام کو خبر کی یہ سنتے ہی امام نے فرمایا:

حضرت عباس کو مقصد معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا۔

''بیعت یا حملہ'' دشمن نے مقصد واضح کیا۔

حضرت عباس نے تمام واقعات امام حسین کے سامنے پیش کئے۔

امام نے ایک رات کی مہلت عبادت کے لئے مانگی اور ابن سعد نے اجازت دے دی اور کہلا بھیجا کہ اگر کل تک بیعت قبول کرلی تو یزید کے پاس زندہ لے چلیں گے اور اگر قبول نہ کی تو ہماری فوج حملہ کرکے تباہ کردے گی۔

ایک رات کی مہلت مانگنے میں امام کی بہت سی مصلحتیں شامل تھیں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اعزا وانصار سے اپنی بیعت اٹھالیں اور ان کو اجازت دیں کہ رات کی تاریکی میں کربلا سے باہر چلے جائیں۔

امام نے مدینے سے کربلا تک آزادی ضمیر اور اپنے فکر وشعور کو کام میں لانے پر جتنا زور دیا تھا اس کی حد اور انتہا نہیں۔ شب عاشور کی تقریر میں امام نے ایسے نازک مرحلے

طے کئے جن کی مثال نہیں۔ امام نے فرمایا:

''امابعد! (خدا کی قسم) میں اپنے اصحاب سے زیادہ بہتر کسی کے اصحاب کو نہیں جانتا اور باوفا نہیں پاتا اور نہ اپنے اہلبیتؑ سے زیادہ شائستہ اور بہتر کسی کے اہلبیتؑ کو پاتا ہوں۔ خدا تم کو میری طرف سے بہترین جزا دے۔ تم آگاہ ہو جاؤ کہ یہ لوگ صرف مجھ ہی کو چاہتے ہیں لہٰذا میں تم سے طوق بیعت اتارے لیتا ہوں۔ پردۂ شب حائل ہے، جدھر اچھا سمجھو چلے جاؤ۔

لیکن اس کا اثر فوراً ظاہر ہوا۔ مخاطب کیا تھا انصار کو لیکن حضرت عباسؑ بے ساختہ اُٹھ کھڑے ہوئے، جس نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے امام نے عزیزوں کو مخاطب نہیں کیا تھا، جواب بھی وہی ملا۔ اگرچہ صرف تین جملوں میں۔

''ہم ایسا کیوں کریں؟ پھر خود ہی فرمایا، اس لئے کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ خدا آپ کے بعد ہمیں کبھی زندہ نہ رکھے۔

اس کے بعد جتنی بھی تقریریں ہوئیں سب اسی کے مطابق تھیں۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے یہ قیامت خیز رات عبادت میں بسر کی۔

عاشور کی صبح طلوع ہوئی۔ تھکے ہوئے بھوکے پیاسے سپاہی موت کے انتظار میں تھے اور مطمئن وخوش تھے۔ لشکر حسینی کی ترتیب اور علمبردار کا انتخاب ہوا۔

تاریخ شاہد ہے کہ صبح عاشور امام حسینؑ نے میمنہ لشکر پر زہیر اور میسرہ پر حبیب بن مظاہر کو مقرر کر کے اپنے بھائی عباسؑ کو علم دے کر علمبردار بنایا۔ اور پھر جناب زہیر علم فوج لے کر عباسؑ کے پاس آئے اور کہا:

''اے عباس آپ کے پدر بزرگوار حضرت علیؑ نے جب بعد وفات سیدہ عالمؑ شادی کرنی چاہی تو حضرت عقیل سے جو عربی نسب کے ماہر تھے کہا تھا کہ میں ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو شریف النفس اور کریم الحسب خاندان کی ہو۔ اور اس سے ایسا بہادر بچہ پیدا ہو جو ہمارے فرزند حسین کی بڑی بہادری سے زمین کربلا پر مدد کرے۔

حضرت عباسؑ جوش شجاعت سے بولے: ''واللہ آج وہ شجاعت دکھاؤں گا جو آپ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔''

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عباس کو یہ منصب جلیل ملنا کوئی معمولی بات نہیں، یہ وہ منصب ہے جو حضرت محمدؐ کے ذریعہ حضرت علیؑ و حضرت جعفرؑ کو ملا تھا۔ آج وہی منصب امام حسینؑ سے حضرت عباسؑ نے پایا۔

حضرت عباس نے پہلے اپنے متحد البطن بھائیوں کو بھیجا۔ فرمایا مرنے جاؤ تاکہ ہم صبر کریں۔ اور اللہ سے اجر کے طالب ہوں۔

جناب عبداللہ میدان کربلا کی جانب روانہ ہوئے اور بڑی جاں بازی سے کام لیا۔ جوش کے ساتھ جنگ کی اور جام شہادت نوش فرمایا۔

اب دوسرے بھائی عثمان روانہ ہوئے۔ یہ جناب عبداللہ سے دو سال چھوٹے تھے۔ آپ نے حضرت علیؑ کے ساتھ چار برس، امام حسنؑ کے ساتھ چودہ برس اور امام حسینؑ کے ساتھ ۲۳ ر سال زندگی گزاری۔ حضرت علیؑ نے آپ کا نام عثمان رکھا تھا، فرماتے تھے کہ میں نے ان کا نام عثمان اپنے دوست عثمان بن مظعون کی یاد میں رکھا ہے۔

حضرت عثمان نے فرمایا:

''اے حسینؑ کے دشمنو! تم کو معلوم ہے کہ میں معمولی حیثیت کا انسان نہیں ہوں، میرے بزرگ علیؑ ہیں جن کے کارہائے نمایاں دنیا کے سامنے ہیں۔ وہ (علی) رسولؐ خدا کے ابن عم ہیں اور میرا بھائی حسین بے شمار چیدہ انسانوں میں سے ایک ہے۔ وہ رسولؐ اللہ اور ولی اللہ کے بعد سب سے بڑے سردار ہیں۔ اس کے بعد بڑی بہادری سے جنگ کی اور ناگاہ خولی بن یزید اصبحی کے تیر سے شہید ہوئے۔

اب جناب عباس کے بھائی حضرت جعفر عازم میدان جنگ ہوئے، آپ اپنے بھائی عثمان سے دو سال چھوٹے تھے۔ آپ نے بھی خوں ریز جنگ کی، خولی بن یزید اصبحی نے آپ کے خون ناحق سے ہاتھ رنگے۔

شیخ مفید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عباس کے بھائیوں کی قبر کا نشان نہیں ہے بلکہ یہ سب ان لوگوں میں ہیں جن کو ایک جگہ دفن کیا گیا ہے۔

اپنے بھائیوں کی قربانی دینے کے بعد حضرت عباسؑ میدان جنگ میں تشریف لائے۔ اس وقت امام حسینؑ پر افسردگی چھا گئی۔ آپ نے فرمایا:

''بھائی! تم ہی تو ایک ہمارے لشکر کی نشانی تھے اور تمام لشکر کے علمبردار تھے، جب تم بھی چلے جاؤ گے تو ہماری یہ مختصر جماعت پراگندہ ہو جائے گی۔

لیکن جب حضرت عباسؑ نے اصرار کیا تو امام نے اجازت دے دی اور فرمایا کہ جس طرح ممکن ہو بچوں کی پیاس کا خیال رکھنا۔

اجازت پا کر حضرت عباس میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے اور فوج یزید کو مخاطب کرتے ہوئے امام مظلوم کا پیغام ان تک پہنچا دیا۔

حضرت عباسؑ نے اب اپنی تلوار کی طاقت سے فوجوں میں انتشار پیدا کیا اور فرات کی طرف پیش قدمی کی۔ اس وقت ایک زبردست شجاعت کا مظاہرہ ہوا۔ آپ نے اسد اللّٰہی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ فوج بھاگ گئی پانی پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ چلو میں پانی بھر لیا۔ ضمیر سے باتیں ہوئیں، ایک فیصلہ ہوا۔ پانی پھینک کر مشک میں پانی بھر کے اس کی حفاظت کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ مخالفین کو شکست کا یقین ہو گیا۔ چنانچہ کمین گاہ سے پہلے داہنا ہاتھ قلم کیا گیا پھر بایاں ہاتھ، پھر بھی آپ مقابلہ کرتے رہے، دانتوں سے مشک پکڑ لی۔ لیکن ایک تیر مشک پر لگا، احساس ذمہ داری کو سخت ضرب لگی۔ سر پر دشمن نے گرز مارا۔ گھوڑے سے زمین پر گرے۔ شجاعت حضرت عباسؑ کی لاش پر ثنا خواں تھی۔ وفاداری نازاں تھی، خلوص کی پیشانی فخر سے چمک رہی تھی۔

شہادت کے وقت آپ کی عمر صرف چونتیس ر ۳۴ سال کی تھی۔ حضرت عباسؑ کی شہادت پر امام نے فرمایا اس وقت میری کمر ٹوٹ گئی۔ چارہ و تدبیر کی راہیں بند ہو گئیں۔

حضرت عباسؑ شہید ہو گئے، اور اپنی زندگی دنیا کے حوالے کر دی کہ جس طرح چاہو اس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ مصلح، سیاسی رہنما، کمانڈر ان سب کے لئے آپ کی زندگی بطور مثال موجود ہے۔

وفا، جاں نثاری اور ایثار و قربانی کی یہ شمع بظاہر بجھا دی گئی، لیکن وہ آج بھی پوری طرح ضوفشانی کر رہی ہے۔

قصیدہ

درمدح سید شبان جنت ابن رسولؐ ولدِ علیؑ و بتولؑ حضرت امام حسینؑ

لسان الشعراء جناب سید مجاور حسین نقوی تمنّاؔ جائسی

نہ جانے کس کے شوق دید میں ہیں جا رہے تارے
کہ مُڑ کر ساتھیوں کو بھی نہیں اب دیکھتے تارے

حسینؑ ابن علیؑ پیدا ہوئے ذرے بنے تارے
ضیا سے چہرۂ پُرنور کی شرما گئے تارے

نہ طعنہ زن ہوں کیوں مہتاب پر چھوٹے بڑے تارے
کہ نکلیں گی جناب سیدہؑ اب دیکھنے تارے

مرے مولا ترے حُسن عقیدت کے وہ ہیں عالم
دکھائی دیتے ہیں گردوں پہ جو چھوٹے بڑے تارے

سماں اس رات کا ہے آسماں پر دید کے قابل
مہِ نو کی کہیں ضو ہے کہیں چھٹکے ہوئے تارے

کوئی کہہ دے نجومی اب اُٹھا رکھیں حساب اپنا
کہ مالک آج کل ہیں دن کے ذرّے رات کے تارے

ہوئے تھے چشمکوں سے برق کی پہلے تو شرمندہ
مگر جب ابر کا پردہ ہٹا تو ہنس پڑے تارے

نہ جانے ہے یہ جلوہ کہکشاں کا آج گردوں پر
کہ دوہری باندھ کر صف سوئے یثرب ہیں چلے تارے

ترے ملبوس پر اے چرخ اب نظریں نہیں تھمتیں
ازل کے دن ٹکے تھے کیا اسی شب کے لئے تارے

مٹا شکوہ مریض ہجر کو اب تیرہ بختی کا
خوشی سے قلب یوں چمکا بنے سب آبلے تارے

یہ کس کے حسن نے کی دفعتاً ایسی کشِش پیدا
کہ سینوں سے کھنچے دل، اور گردون سے کھنچے تارے

بنایا ہے جسے مشتاق نظروں نے ملائک کی
اُسی تار نگہ کے جال میں اب ہیں پھنسے تارے

سوم شب ماہ شعباں کی کچھ اس انداز سے آئی
کہ خود اپنی تجلی دیکھ کر ہنسنے لگے تارے

نہیں بے وجہ ان کا جھلملانا آج گردوں پر
کسی کے حُسن روز افزوں کے دیتے ہیں پتے تارے

یہ کس کے پرتو رخسار سے کیا جانے شرم آئی
کہ گر کر خاک میں چھپنے لگے ٹوٹے ہوئے تارے

حباب بحر وقت صبح پانی پر یہ تاباں ہیں
اُبھر آئے ہیں یا سب چرخ کے ڈوبے ہوئے تارے

خجل ہوتے نہ کیوں اس شب کو انجم ضو سے زرّوں کی
کہ وہ نزدیک کے تارے تھے اور یہ دور کے تارے

سحر نے آسماں پر جب کہ پوشاک شفق بدلی
تو جو پہلے رو پہلے تھے سُنہرے وہ ہوئے تارے

زمیں سے آسماں تک آج یہ کس کی ضیا پھیلی
کہ گلشن میں کھلے گل اور گردوں پر ہنسے تارے

نچھاور کر رہا تھا کچھ ضرور اس شب کو گردوں بھی
مگر کیا جانے وہ موتی تھے یا تھے چرخ کے تارے

سحر کو اُوس کے قطروں کا اُڑنا یہ بتاتا ہے
کہ مرکز پر چلے پھر رات کے ٹوٹے ہوئے تارے

نظر کرنا رُخِ پُرنور پر کب شہ کے آساں تھا
ہنسی بجلی بھی یوں شرما کے بادل میں چھپے تارے

جو آغوش جناب سیدہؑ میں آج ہے بچہ
اسی کو آنکھیں کھولے رات بھر ڈھونڈھا کئے تارے

کہیں جس کو رسولؐ حق خود اپنی آنکھ کا تارا
نہ ہوں بے چین کیوں افلاک پر اُس کے لئے تارے

جہاں کا ذرّہ ذرّہ ہو منور جس کے پرتو سے
بچھائیں کیوں نہ آنکھیں اپنی اُس کے واسطے تارے

تمنّاؔ شبّرؑ و شبّیرؑ کے رتبوں کا کیا کہنا
زمانے میں اُتر آئے تھے یہ دو عرش کے تارے

قصیدہ

مدیح قائم آل محمد امام زمانہ علیہ السلام

لسان الشعراء مولوی سید مجاور حسین نقوی تمناؔ جائسی

چمن میں آج کی شبنم نے کچھ ایسی دُر افشانی
کہ سچے موتیوں کی آبرو پر پھر گیا پانی

زمانہ آج کی شب چاندنی سے تھا یہ نورانی
چھلک آیا تھا یا ظرف مہ تابندہ سے پانی

نہ جانے پڑ گیا کس کا یہ عکس روئے نورانی
بیاض صبح صادق جو بنی اک ایک پیشانی

رگوں میں خون کو گردش ہوئی دل کی بڑھی قوت
ہوائے خلد سے بدلی ہوائے عالم فانی

چمک ذروں نے پیدا کی خجل ہوکر چھپے تارے
تن مردہ میں جان آئی مِٹی تکلیف روحانی

کھلیں کلیاں ہنسے گل بن گیا آئینہ ہر چشمہ
ہوا جلووں سے موج افزا گہر کا منجمد پانی

بڑھی خنکی ہوئے عشاق کے سینوں میں دل ٹھنڈے
کٹی وہ خیریت سے تھی جو شب فرقت کی طولانی

چمن میں آج جس کو دیکھ کر دل لوٹا جاتا ہے
نہیں معلوم وہ سبزہ ہے یا مخمل ہے کاشانی

ہوا سے بے سبب جنبش نہیں اشجار گلشن کو
یہ شاخیں کررہی ہیں طفل غنچہ کی مگس رانی

عیاں ہے ماہیان سُرخ کا نہروں سے یوں جلوہ
کہ جیسے ظرف بلوریں میں ہوں یاقوت رُمانی

وہ رنگا رنگ گل بکھرے ہوئے تھے فرش سبزہ پر
نظر سمجھی تھی جس کو دور سے قالین ایرانی

اُڑا آہِ دل بلبل سے خون اتنا شبِ فرقت
کہ لاکھوں گل چمن میں ہوگئے تا صبح افشانی

چھپا رنگ لباس ماتمی رنگ مسرت میں
ہوا عکس شفق سے سُرخ وہ سبزہ جو تھا دھانی

چمن میں نخل سنبل پر ہے بیل اک زرد پھولوں کی
کہ بکھرائے کھڑی ہے بال جوگن کوئی مستانی

کچھ ایسی لہر آئی دفعتاً بحر مسرت میں
کہ جا کر چھپ رہی زلف بتاں میں خود پریشانی

ستاروں پر فلک کے اب ہے شک سب کو حبابوں کا
ترقی پر ہے ایسی نور کے دریا کی طغیانی

کھڑے رہ کر چمن میں کیا ملا پھل سروِ گلشن کو
بہت بہتر تھا کی ہوتی کسی کے در کی دربانی

قبائے گل کا دامن ہوگیا گلشن میں صد پارہ
چمن میں آج کی شبنم نے ایسی گوہر افشانی

دکھاتا ہے فلک پر اپنی ضو یہ ابر کا لکّہ
رواں ہے یا سر موج ہوا تخت سلیمانی

مہ کامل سے جو تھالے گلستاں میں مشابہ ہیں
انھیں میں رات بھر برگ شجر نے چاندنی چھانی

نہ جانے کیوں تھمی یہ بحر میں کیوں چین سا آیا
کہ لے کر موج نے انگڑائی چادر آب کی تانی

رگ گل کو بھی اب چھیڑے کوئی تو ہولہو جاری
ہوئی ہے خون کی جوش نمو سے ایسی ارزانی

چمک پر موج دریا کی ہے یوں اب برق خندہ زن
کسی معشوق کو جیسے ہنسی آتی ہے کھسیانی

چمن میں دیکھوں اب کس سمت دل کھنچتے ہیں اے بلبل
اُدھر ہیں چہچہے تیرے اِدھر میری غزل خوانی

نہیں معلوم وہ گل کون سا دنیا میں پھولا ہے
کیا کرتی ہے نرگس رات دن جس کی نگہبانی

سحر کو باغ کے پھولوں پہ یوں ہیں اوس کے قطرے
ابھی جیسے کہ نکلا ہے برس کر ابر نیسانی

چڑھی ہے بیل یوں بل کھا کے شاخ گل پہ گلشن میں
کسی نازک کلائی میں ہوں جیسے چوڑیاں دھانی

سنہری ایک چادر لے کے دھوپ آئی گلستاں میں
حسینان چمن کی قہر تھی گلشن میں عریانی

وہیں پر قہقہہ زن آج ہے گلزار میں بلبل
اکڑتا ہے جہاں پر دم بدم سروِ دبستانی

کوئی کہہ دے دکھائے نہر کو جلوے نہ آئینہ
کہ جب آیا نہ مصرف میں تو پھر کس کام کا پانی

چمن میں ننھی ننھی بوندیاں یہ آج پڑتی ہیں
ہوا سے اڑ کے یا ہے منتشر فوّاروں کا پانی

اُسی کے چھیڑنے کو دم بدم آتی ہے گلشن میں
ہَوا یوں زلف سنبل پر ہوئی ہے آج دیوانی

عجب کیا جو گلے کا طوق اب اپنے بڑھا ڈالے
اسی دن کی وہ تھی منت کہ جو قمری نے تھی مانی

گل باغ نبیؐ کا عشق مجھکو، تجھکو پھولوں کا
بتا بلبل ہوئی دانائی کس سے کس سے نادانی

تمنّا دوسرا مطلع بھی اب پڑھ دو کوئی ایسا
کہ اہل بزم میں اک کیفیت پیدا ہو وجدانی

یہ جس کی ضو پہ بجلی کو ہنسی آئی ہے کھسیانی
وہ برق طور ہے یا حضرت حجتؑ کی پیشانی

تصور میں چڑھا اس درجہ ان کی تیغ کا پانی
کہ آخر دھو گئے ہر قلب سے وسواس شیطانی

یوہیں ہے ربط اب شیعوں کا ہردم عیش وعشرت سے
کہ جیسے متحد آپس میں ہیں اعضائے جسمانی

تجسس میں ترے شب بھر پھرے گا اب نہ اے آقا
جلا کر اپنی مشعل دشت میں غول بیابانی

بندھا ایسا تصور ناگہاں زہریلی نظروں کا
کہ لو شمع سحر کی ہوگئی ہر آنکھ میں دھانی

قریں ان گل سے گالوں کے نہیں آغاز ہے سبزہ
گلابی وہ ہے مہتاب اور دھواں اُٹھا ہے یہ دھانی

ہمیشہ نقش ثانی نقش اول سے جو ہو بہتر
تو پھر کیونکر نہ حضرت کو کہوں میں یوسف ثانی

مرے آقا تمہاری زیست سے سب تو ہوئے شاداں
مگر ہاں بڑھ گئی کچھ اور آئینہ کی حیرانی

اثر کفار پر یہ ہے ترے رعب و جلالت کا ... کہ یوں لرزاں ہیں دل ہوں کشتیاں جس طرح طوفانی
تری صورت کشی گر سہل ہوتی اے مرے مولا ... چھپا لیتے کفن میں منھ نہ پھر بہزاد اور مانی
قیامت ہے تصور تیرے گھونگھر والے بالوں کا ... یہی چکر وہ ہیں جن میں پھنسی ہے عقل انسانی
نہ آئے ذکر تک پھر لحن داؤدی کا دنیا میں ... کسی دن سُن لیں جو اہل جہاں تیری خوش الحانی
نگاہ غیظ تیری دیکھ لے تو ایسا بے حس ہو ... کہ دب کر شیر قالیں خود بنے شیر نیستانی
کسی دن اتفاقی تو جو اُلٹی سانس لے مولا ... تو کھنچ آئے جہاں میں خود ہوائے باغ رضوانی
ہوئی تھی حیدرؑ صفدر کی تو چالیس جا دعوت ... مگر مولا تری ہر وقت ہے ہر دل میں مہمانی
امامت کا نہ ہو دنیا میں کیونکر خاتمہ تجھ پر ... وہ تیرا جد تھا آقا جو کہ تھا اسلام کا بانی
تری تصویر اے مولا کوئی کھینچے تو کیا کھینچے ... سراپا قدرت خالق سراپا نور ربانی
گلابی رُخ کے پرتو سے کہیں تیرے شفق پھولی ... کہیں عکس خط عارض سے سبزہ ہوگیا دھانی
شہا اک دن ضروری تیرا جلوہ ہم بھی دیکھیں گے ... زیارت لازمی ہے، ہو بمشکل یا بہ آسانی
مرے آقا اسی سے آج تک ہو تم نہاں شاید ... کہ نور حق کو دیکھے یہ نہیں ہے تاب انسانی
مہ شعباں کی پندرھویں سحر کو دہر میں آیا ... ہمارا بارہواں حاکم علیؑ کا گیارہوں جانی
ترا ذکر ولادت باعث تسکیں ہے اے مولا ... ترا اسم گرامی ہے مُزیل درد پنہانی
ترا روئے کتابی ہے کہ ہے اک مصحف ناطق ... لکیریں دونوں ہاتھوں کی ہیں یا آیات قرآنی
مرے مولا قدم جو آپ کے ہوتے نہ دنیا میں ... تو کب کا غرق ہو جاتا جہاز عالم فانی
مرے مولا نہ رہتی جو تمہاری دید کی حسرت ... تو وقت خواب کیوں تن سے نکلتی روح سیلانی
مرے مولا یہ ادنیٰ فیض ہے تیری ولادت کا ... جو راحت کی کمی میں دب گئی غم کی فراوانی
امام مہدیؑ ہادی کا یہ روز ولادت ہے ... ملک آئے ہیں گردوں سے پئے گھوارہ جنبانی
نبیؐ کا جانشیں اور لخت دل گیارہ اماموں کا ... خدا کا خاص بندہ صورت وسیرت میں لا ثانی
یہی وہ ہے کہ ہیں کفار جس کے خوف سے لرزاں ... اسی کے ڈر سے دل رستم کا بھی ہے قبر میں پانی
میں سینہ چاک کر کے اپنے دل کو پیش کش کردوں ... اگر حضرت یہ کہہ دیں ہے تری مقبول قربانی
مسرت سے ہوا ہر ایک چہرہ آج یوں روشن ... کہ وقت صبح آئینے نے صورت تک نہ پہچانی
زیارت مہر نے آج آخر اس چہرے کی کر ہی لی ... وہ پوری ہوگئی جو بات ازل سے دل میں تھی ٹھانی

یوہیں مولا اُلٹ دیں بس نقاب اب آپ بھی رُخ سے
کہ جیسے دہر میں اُلٹی تھی اک دن ارض یونانی

گہر بطن صدف میں اس سے آقا منھ چھپائے ہے
کہ بے اذن آپ کے ممکن نہیں ہے آبرو پانی

مرے مولا منافق پھر وہی ہیں جوش میں آئے
بظاہر جو ہیں مرد اور عادتیں جن کی ہیں نسوانی

جہاں خالی جو ہوتا عدل اور انصاف سے تیرے
تو پیتے شیر بکری پھر نہ یوں اک گھاٹ پر پانی

تمنّا بس دعا کے واسطے اب ہاتھ اُٹھاؤ تم
قصیدہ ہوگیا حد سے زیادہ دیکھو طولانی

کہو حضرت سے مولا میری قسمت بن نہیں چکتی
وہ سب میں کر چکا تھیں کوششیں جتنی بھی امکانی

لہٰذا عرض ہے یہ آپ کی خدمت میں اے آقا
گنہ یوں دھوئیے دل سے کہ مٹ جائے پریشانی

مرے مولا مری قسمت کا پست ایسا ستارا ہے
کہ تارہ سا کنوئیں کہ تہہ میں چمکے جس طرح پانی

تمنّا پھر نہ ہوتا نام سے بھی اوج کے واقف
تخلص میں آگر اس کے نہ ہوتی تائے فوقانی

غرض یہ ہے کہ اب ایسی مجھے دلوائیے راحت
نہ روحانی کوئی ایذا رہے باقی نہ جسمانی

قصیدہ ـــ در مدح حضرت ابوالفضل العباسؑ

سیدالشعراء مولوی سید محمد حسن نقوی سالکؔ مرحوم

سامنے تصویر ابھری رنگ رخ کیوں کر کھلا
دیکھا جب آئینہ تب آئینے کا جوہر کھلا

کس کے دست نازنیں نے ماہ نو کی شکل میں
رکھ دیا ہے سینۂ افلاک پر خنجر کھلا

کس کے دل میں کیا چھپا تھا ہوگیا سب آشکار
مل گئیں نظروں سے نظریں راز دل اکثر کھلا

آئینہ حیرت کا نظریں بن گئیں صیاد کی
یوں قفس ٹوٹا کہ سب پر زور بال وپر کھلا

ہم گنہگاروں کی نظریں شرم سے جھک جھک گئیں
نامۂ اعمال دیکھا جب سر محشر کھلا

ایک اشک آرزو کی حسن جو قیمت لگائے
رکھ دیا ہے مصر کے بازار میں گوہر کھلا

ہم سے دیوانوں کو لٹ جانے کا کوئی غم نہیں
چھوڑ کر اکثر نکل آئے ہیں اپنا گھر کھلا

کون کرسکتا تھا یوں تفسیر شرح کائنات
اک مرے اشک وفا سے راز بحر و بر کھلا

دیکھنے میں خوبصورت تھا بہت میدان شعر
خار تھے وادی میں کتنے پاؤں رکھ رکھ کر کھلا

جس طرف جانا تھا مجھ کو لے گئی فطرت مجھے
پھر تو ہر ذرے سے مجھ پر نقش صورت گر کھلا

عالم اسباب کا نقشہ سمجھ میں آگیا
بحر میں کیا بر میں کیا سب راز خشک و تر کھلا

جب وہ منزل آگئی تھی جس کی دھن میں زندگی
دم مسافر نے لیا لپٹا ہوا بستر کھلا

میکدے کی طرح باب چشمۂ کوثر کھلا
موج مئے نے کروٹیں لیں وہ لب ساغر کھلا

نغمۂ گوش سماعت اب ہے ساغر کی کھنک
گردش ادراک کی تقدیر کا چکر کھلا

مے پرستی حاصل ایمان وعقل و ہوش ہے
ہم سے میخواروں پہ یہ بھی کعبہ کے اندر کھلا

مدح مولا میں لب صہبا کو جنبش یوں تو ہو
اہل محفل دیکھ لیں قرآن دل کیوں کر کھلا

چہرۂ عباسؑ پر رنگ رخ حیدرؑ کھلا
جلوۂ نور بنی ہاشم بہ کر و فر کھلا

ہم بتائیں کیا سناتی رہتی ہے موج فرات
یہ ورق الٹا کہاں باب وفا کیوں کر کھلا

اے ہلال ہاشمی، انوار افلاک وفا
جوہر ذاتی کا تیرے ہر جگہ دفتر کھلا

کربلا میں صاف یہ شبیرؑ نے بتلا دیا
سیدہؑ کا لال اک تو بھی ہے یہ سب پر کھلا

وہ شکن عباسؑ کے ماتھے پہ آئی نور کی
وہ غلاف اترا وہ جھپکی آنکھ وہ خنجر کھلا

یوں نہیں شہ نے دیا تھا اپنے لشکر کا علم
تھا بھرم کتنا یہ تیرے دست و بازو پر کھلا

یہ علیؑ ہیں کربلا میں یا علیؑ کا شیر ہے
کس کے ہاتھوں میں نشان فوج پیغمبر کھلا

کہہ رہی تھی غیظ میں یہ تیغ عباسؑ علیؑ
آج ہم دیکھیں گے پھر جبریل کا شہپر کھلا

آمد عباسؑ ہے دنیا میں پھیلی ہے خبر
نور مرکز سے چلا دروازۂ خاور کھلا

مدح ولی عصرؑ

شوقؔ بہرائچی

آمد ہے اس غضنفر آہو شکار کی
دادا نے جس کے کفر کی لڑھیا اُلار کی

غیبت میں بھی امام کا جلوہ نظر پڑے
عینک لگا کے دیکھو اگر اعتبار کی

اک ضرب ان کی طاعت عالم سے یوں فزوں
جس طرح سو سنار کی اور اک لوہار کی

نرجس کے گل عذار کا دیکھا جو ہے جمال
گرنے لگی ہے رال عروس بہار کی

دجال کرتا پھرتا ہے دعویٰ خدائی کا
گدی سے کھینچ لیجے زباں اس چمار کی

اب وہ الٹ رہے ہیں رخ پاک سے نقاب
اب شامت آ رہی ہے غم روزگار کی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے ولادت کا انہدام

اسلامی شناخت کا خاتمہ : مولانا کلب جواد صاحب

لکھنؤ۔ جمعہ کے موقع پر تاریخی آصفی مسجد میں مولانا سید کلب جواد صاحب نے ہزاروں بندگان خدا کو دین اور شریعت پر چلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے ہر شخص کو اچھے یا برے کاموں کا حساب بارگاہ خداوندی میں پیش کرنا ہے جس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور انسان کی حقیقی زندگی بعد از موت شروع ہوتی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اگر انسان دنیا میں اچھے کام کرتا ہے تو اس کا پھل دنیا اور آخرت میں ملتا رہے گا۔ اور اگر برے کام کرے تو اس کے گناہوں کی سزا بھی بھگتنا پڑے گی۔



مولانا کلب جواد صاحب نے ایران کے نومنتخب صدر ڈاکٹر محمود احمدی نژاد کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ جب تہران کے میئر تھے تب انھوں نے شہر کی خود صفائی کر کے ایک مثال قائم کی تھی اور آج ایران کے صدر ہوتے ہوئے بھی اپنے ذاتی مکان میں رہتے ہیں اور ذاتی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے صدر ایران کے حق میں دعائیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ پروردگار انھیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

مولانا کلب جواد صاحب نے سعودی عرب میں رسول اکرمؐ کی جائے ولادت کو منہدم کرنے کے منصوبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مکہ اور مدینہ کہ بچی کھچی تاریخی عمارتوں کو منہدم کرنے کی ایک عالمی سازش ہے اور کسی روز بھی یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بلڈوزر رسول اکرمؐ کے مکان کو تاراج کردے۔

مولانا کلب جواد صاحب نے کہا کہ مکہ اور مدینہ کے آخری ایام کو ہم سب دیکھ رہے ہیں مدینہ میں تو بری طرح سے تباہی مچائی گئی اور اب وہاں چودہ سو سال پرانی تاریخی عمارتوں میں سے چند ہی باقی ہیں۔ شہر مکہ کی توسیع کاری اور جدید تقاضوں کو پورا کرنے کا جنون سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ قومیں ورثہ کو محفوظ کرتی ہیں اور ان کے تحفظ پر جان قربان کرتی ہیں لیکن سعودی عرب میں حالات برعکس ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کی نقل کرنے والی حکومتیں ان ممالک کے ان اصولوں کی تقلید کیوں نہیں کرتیں جو اپنے ماضی کی وراثت کو محفوظ کرنے میں مصروف ہیں۔ ان مقامات کو یہ طاقتیں محفوظ رکھے ہوئے ہیں جہاں عالمی جنگ میں بمباری ہوئی تھی اور بموں کے نشان ہیں۔ مولانا کلب جواد صاحب نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ مکہ اور مدینہ کی تاریخ کو ختم کرنے کا مطلب ہے اسلامی شناخت کو بھی ختم کرنا۔ ان مقامات سے اللہ کا پیغام دنیا میں پھیلایا گیا اور ان مقدس مقامات کی انتہائی اہمیت ہے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ جنت البقیع اور دوسری اہم ترین مقامات پہلے ہی برباد کئے جاچکے ہیں۔

مولانا نے مسلمان سیاسی رہنماؤں پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حیثیت کسی بھی پارٹی میں ایک غلام سے زیادہ کی نہیں ہے اور وہ خود اپنی قوم کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ وقف حسین آباد کی زمینوں اور مسلم علاقوں میں شراب خانے کھل رہے ہیں جس سے معاشرے میں تباہی پھیلنے کا سخت خطرہ ہے۔ مولانا نے کہا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تحریک ناکام ہوگئی ہے ان کے لئے کہنا مناسب ہوگا کہ ہم اقلیت در اقلیت ہیں اور ہمارے پاس نہ دولت ہے نہ سیاسی نمائندگی، جو ہیں وہ بھی سرکاری غلام ہیں۔ سوائے ظلم پر احتجاج کرنے کے ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مولانا نے کہا کہ جس قوم کے پاس طاقت ہوتی ہے برسر اقتدار پارٹیاں بھی انھیں کی سماعت کرتی ہیں۔ ہماری طاقت اتحاد اور احتجاج ہے۔

شیطان رجیم کہنے پر یزیدی فرقہ والوں کا احتجاج

بغداد۔ عراق کے شمالی حصے کردستان میں بسنے والے یزیدی فرقے نے وزیر اعظم ابراہیم جعفری کے ہر تقریر سے پہلے ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پڑھنے پر اعتراض کیا ہے اور کہا کہ اس سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ یزیدی فرقے سے تعلق رکھنے والے یہ افراد ملک طوس یا مور کی پرستش کرتے ہیں اور اس کو شیطان کہتے ہیں۔ عراق میں تقریباً پانچ لاکھ افراد یزیدی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بی۔ بی۔ سی۔ کے مطابق اس فرقے کے نمائندہ کامران خیری کا کہنا ہے کہ ابراہیم جعفری کے ہر تقریر سے پہلے ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' کے کلمات پڑھنے سے ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ یزیدی فرقے سے تعلق رکھنے والے شیطان کو خدا مانتے ہیں اور اس کو بدی کی قوت تسلیم نہیں کرتے۔

ڈاکٹر محمود احمدی نژاد جمہوری اسلامی ایران کے نئے صدر منتخب

جمہوری اسلامی ایران کے رہبر اعلیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کی توثیق

تہران۔ ڈاکٹر محمود احمدی نژاد ایران کے نئے صدر بن گئے۔ اسلامی جمہوری ایران کے رہبر معظم آیۃ اللہ العظمیٰ سیدعلی خامنہ ای مدظلہ العالی نے ان کے انتخاب کی توثیق کردی۔ رخصت پذیر صدر حجۃ الاسلام محمد خاتمی نے ایک سرکاری تقریر میں آیۃ اللہ خامنہ ای کا توثیق نامہ پڑھ کر سنایا کہ: ''میں عوام کے فیصلے کو منظور کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمدی نژاد کو اسلامی جمہوری ایران کا صدر مقرر کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر محمود احمدی نژاد نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر عہدہ اور رازداری کا حلف لیا۔ بعد میں اپنے خطاب کے دوران انھوں نے کہا کہ اس اسلامی حکومت کا مقصد صرف اور صرف عوام کی خدمت کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم بین الاقوامی قوانین کا احترام کرتے ہیں لیکن ہم ان طاقتوں کے آگے نہیں جھکیں گے جو ہمارے اختیارات ہم سے چھیننا چاہتے ہیں۔ اس وقت یوروپی یونین کے ساتھ نیوکلیائی معاملہ کو حل کرنا اور عوام کو سماجی انصاف دلانا ان کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔ واضح رہے کہ ایران کے نیوکلیائی پروگرام پر بین الاقوامی برادری کو اعتراض ہے۔ احمدی نژاد نے کہا کہ ہم سب کے لئے امن وامان اور انصاف چاہتے ہیں لیکن کچھ ملک امن کے نام پر دھمکیاں دے رہے ہیں۔

امریکہ عراق میں شکست کے دہانے پر، برطانوی ممبر پارلیمنٹ گیلووے کا بیان

برطانیہ۔ برطانوی ممبر پارلیمنٹ جارج گیلووے نے کہا کہ برطانیہ اور امریکہ بغداد کے ساتھ ''زنا بالجبر'' کر رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے دورہ کے درمیان انھوں نے کہا کہ غریب عراقی انتہائی سادہ ہتھیاروں سے اپنے شہروں کا نام ستاروں پر لکھ رہے ہیں۔ رسپکٹ پارٹی کے ایم۔ پی۔ جارج گیلووے نے کہا کہ امریکہ عراق میں جنگ ہار رہا ہے۔ لیبر پارٹی کے ایم۔ پی۔ ایرک جائس نے جارج گیلووے کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے کسی حد تک برطانوی فوجیوں کے لئے خطرہ میں اضافہ ہوا ہے۔ جارج گیلووے نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں، ہمیں ان کے نام نہیں معلوم، ہم نے کبھی ان کے چہرے نہیں دیکھے، وہ اپنے شہیدوں کی تصاویر دیواروں پر آویزاں نہیں کرتے، ہمیں ان کے رہنماؤں کے نام نہیں معلوم۔ جارج گیلووے نے بی۔ بی۔ سی۔ کو بتایا کہ وہ برطانوی اور امریکی افواج کو عراق سے واپس بلوا کر خون خرابا روکنا چاہتے ہیں۔ جارج گیلووے نے کہا کہ برطانوی فوجیوں کی جان کو ٹونی بلییئر کی حکومت نے خطرے میں ڈالا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جن ممالک پر امریکہ اور برطانیہ نے قبضہ کیا ہے وہ ان کے ہاتھوں ''زنا بالجبر'' کا شکار ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یروشلم اور بغداد غیر ملکیوں کے ہاتھ میں جوان کے ساتھ اپنی من مانی کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے فوجیوں کے لئے نفرت وہ پیدا کر رہے ہیں جنھوں نے انھیں عراق میں تعینات کیا نہ کہ ہماری طرح کے ان لوگوں نے جو کہ ان کو ملک واپس بلوانا چاہتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اگر تعداد کی بات کی جائے تو جارج بش اور ٹونی بلییئر کے ہاتھوں پر سب سے زیادہ خون ہے۔